مجتبیٰ حسین

www.taemeernews.com

سفرِ لخت لخت

مجتبیٰ حسین

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

www.taemeernews.com

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

SAFAR-E-LAKHT LAKHT

by

Mujtaba Hussain

Year of Ist Edition 1995
Year of Latest Edition 2011
ISBN 978-81-8223-893-0
Price Rs. 150/-

نام کتاب	سفرِ لخت لخت
مصنف	مجتبیٰ حسین
اولین اشاعت	جون ۱۹۹۵ء
تازہ اشاعت	۲۰۱۱ء
قیمت	۱۵۰ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

www.taemeernews.com

ترتیب

☆	گزارشِ احوال واقعی	7
1	دو باتیں	9
2	اودیس سے جانے والے بتا	14
3	سفر کرنا ہمارا مردانہ ہوائی جہاز میں	22
4	لندن میں ہمیں دفن کرنے کی تیاریاں	26
5	قیام الدین کے گھر ہمارا قیام	34
6	برطانیہ میں دھوم ہماری زباں کی ہے	42
7	کچھ ذکرِ خیر و شر ساقی فاروقی کا	49
8	کچھ حال مشتاق احمد یوسفی سے ملاقات کا	57
9	کچھ نقی تنویر کے بارے میں	66
10	پیرس میں مسرور خورشید نے ہمیں مسرور کیا	74
11	حیدرآباد کا جو ذکر کیا	82

www.taemeernews.com

12	ایر پلگوٹ میں ہمارا پہلا سفر	91
13	ہم تاشقند سے بول رہے ہیں	98
14	ہم نے اردو میں ازبیک کھانا کھایا	105
15	ازبکستان کے ادیبوں کے درمیان	112
16	دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ	119
17	جدہ میں جشن طنز و مزاح ——— ایک خطبہ صدارت	129
18	رام پور میں دو دن	138

www.taemeernews.com

انتساب

یارِ دلدار

شہرِ دوست

کے نام

www.taemeernews.com

گزارشِ احوالِ واقعی

لگ بھگ نصف صدی پہلے میں نے اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر، جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ ''سیاست'' کے حکم کی تعمیل میں، محض اتفاقی طور پر، 12 اگست 1962 کو دن میں ٹھیک ساڑھے دس بجے مزاح نگاری شروع کی تھی۔ اس کا آغاز فرضی نام کے ساتھ فکاہیہ کالم نگاری سے ہوا۔ دو چار برس بعد جب اپنے اصلی نام کے ساتھ لکھنے کی ہمت پیدا ہوئی تو انشائیوں، شخصی خاکوں، سفرناموں، رپورتاژ اور نہ جانے کن کن اصناف و اسالیب کو مشرف بہ مزاح کیا۔ چنانچہ اتنے لمبے ادبی سفر کے بعد اب مزاح نگاری ہی میری واحد پہچان بن گئی ہے۔ کیا بننا تھا اور کیا بن گئے۔ اب تو کچھ سوچنے کا وقت بھی نہیں بچا۔ یوں بھی اس حسنِ اتفاق کا خیال آتا ہے تو ہنسی ہی آجاتی ہے کیونکہ ایک آدمی جب ہنسنے پر مجبور کردیا جاتا ہے تو تقدیر کے جبر کے نتیجہ میں صورتحال بہرحال مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔

1968 میں میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ '' تکلف برطرف'' شائع ہوا تھا جسے ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ بعد میں حیدرآباد سے میری جتنی بھی کتابیں چھپیں اُن کی اشاعت کا اہتمام میرے دوستوں بالخصوص میرے مزاح نگار دوست مسیح انجم مرحوم نے کیا۔ اپنے لاابالی پن کی وجہ سے میں نے اپنی کتابوں کی اشاعت کے معاملہ میں کبھی شخصی دلچسپی نہیں لی۔ مجھے اس بات کا احساس تو تھا کہ ان کتابوں کی کتابت وطباعت کا معیار وہ نہیں ہے جو ہونا چاہئے۔ یوں بھی 1972 میں دہلی منتقل ہوجانے کے بعد میری بے ہنگم مصروفیات نے کبھی اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں اس جانب توجہ کرسکوں۔

1989 میں جب میں پہلی بار پاکستان گیا تو میرے کرم فرما مشفق خواجہ نے میری مزاح نگاری کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا ''تمہارا کمال یہ ہے کہ ناقص طباعت و کتابت والی ان چھوٹی چھوٹی کتابوں کے ذریعہ تم نے مزاح نگاری میں بڑا نام کمایا ہے، سچ پوچھو تو تمہاری بعض

www.taemeernews.com

کتابوں کی ناقص طباعت کا یہ عالم ہے کہ یہ کتابیں مطبوعہ ہونے کے باوجود مجھے تو غیر مطبوعہ ہی نظر آتی ہیں"۔ اس پر میں نے عرض کیا تھا "یا خواجہ ادیب نواز! میں نے جان بوجھ کر ان کتابوں کی طباعت کے معیار کو بلند نہیں ہونے دیا تاکہ قارئین کو میری مزاح نگاری کے معیار کی بلندی کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے۔ طباعت کا معیار اچھا ہو تو لوگ کتابوں کو رواروی میں سرسری طور پر پڑھ لیتے ہیں۔ چھپے ہوئے متن کی تہہ داریوں اور باریکیوں کی طرف اُن کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ قاری کی گہری توجہ اور پورے انہماک کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ کتاب کی طباعت کا معیار ناقص ہو"۔

اُس وقت تک میری دس بارہ کتابیں چھپ چکی تھیں جو نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ ان کے کئی ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔ بالآخر 2000 میں امریکہ میں مقیم میرے بزرگ دوست حسن چشتی نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے تعاون سے میری کتابوں کو طباعت کے اعلیٰ معیاروں کے ساتھ چھاپنے کا منصوبہ بنایا اور چار ضخیم کتابیں شائع کروا دیں۔ بعد میں سید امتیاز الدین، احسان اللہ احمد اور رحیل صدیقی نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور اب تک اس سلسلہ کی بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

پچھلے دنوں برادرم محمد مجتبیٰ خان، مالک ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے مجھے بتایا کہ میرے بیشتر قارئین اب بھی میری اُن پرانی کتابوں کو پوچھتے رہتے ہیں جو اب نایاب ہو چکی ہیں۔ کیوں نہ ان کتابوں کو طباعت کے عصری معیار اور تقاضوں کے مطابق چھاپ دیا جائے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب مجتبیٰ خان کی اسی تجویز کے نتیجہ میں شائع ہو رہی ہے۔ گویا اب میری ساری کتابیں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کی معرفت قارئین کو دستیاب ہو سکیں گی۔ مجھے امید ہے کہ ان کتابوں کی طباعت کے معیار میں اضافہ کے باوجود میری مزاح نگاری کا معیار (اگر ہے تو) برقرار رہے گا۔

مجتبیٰ حسین

23/اکتوبر 2010

B -107, ROYAL ORCHID
RED HILLS
HYDERABAD-500001

☆☆

www.taemeernews.com

دو باتیں

''سفر لخت لخت'' ان سفر ناموں کا مجموعہ ہے جو ہم نے اسّی (۸۰) کی دہائی میں مختلف ملکوں کی سیاحت کے بعد لکھے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں ہمیں سوامبینہ کے لئے پہلی بار بیرونی سفر پر جاپان جانے کو موقع ملا تھا۔ جاپان پہلا ملک تھا جو اپنے مخصوص کلچر اور مخصوص جغرافیائی حالات کی وجہ سے بالکل مختلف اور انوکھا لگا تھا۔ لگتا تھا یہ ایشیاء میں ہے اور نہیں بھی ہے۔ سڑکوں اور بازاروں میں دکھائی دینے والا جاپان مغرب کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ دکھائی دیتا ہے لیکن جو جاپان، جاپانی گھروں میں نظر آتا ہے وہ خالص ایشیائی ملک ہے۔ دن بھر عصری مشینوں کو کنٹرول کرنے اور جدید کاروباری اداروں میں کام کرنے والے جاپانی جب شام کو اپنے گھروں میں واپس آتے ہیں تو اچانک ان کا حلیہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ حلیہ ہی نہیں ان کا مزاج بھی یکسر بدل جاتا ہے۔ مغربی لباس کی جگہ جاپانی لباس ان کے بدن کی زینت بن جاتا ہے۔ ہر کمرہ میں جانے سے پہلے چپل تبدیل کئے جاتے ہیں۔ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے اور جاپانی وقفہ وقفہ سے ایک دوسرے کی ایسی تعظیم و تکریم کرتے ہیں کہ ہم جیسے ان کی تقلید کرنے لگیں تو زندگی بھر کمر کے درد سے کراہتے رہ جائیں۔ ان کے کابکی شوز، ان کے کھانے اور کھانے کے انداز، ان کے رقص اور موسیقی اور ان کا رہن سہن سب کچھ ہی مختلف ہوتا ہے۔ تجسّس آفرینی اور سحر آفرینی کے معاملہ میں جاپان تب بھی ہمارے لئے منفرد ملک تھا اور کئی ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد آج بھی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم نے جاپان کا سفرنامہ بڑے اشتیاق اور گہرے تجسس کے ساتھ لکھا تھا۔ سفرنامہ جاپان کو نہ صرف اردو کے قارئین نے بے حد سراہا بلکہ یہ

www.taemeernews.com

کئی ہندوستانی زبانوں کے علاوہ خود جاپانی میں بھی شائع ہوا۔

جاپان کے سفر کے بعد ہمیں ۱۹۸۴ء میں تین مہینوں کے لئے انگلستان، فرانس، امریکہ اور کناڈا جانے کا موقع ملا۔ اس سفر کا حال بھی تفصیل سے لکھنے کا ارادہ تھا لیکن انگریزی زبان اور ادب سے واقفیت کی وجہ سے یوروپ اور امریکہ کسی بھی پہلو سے اجنبی نہ لگے۔ یوں بھی ان دنوں بے شمار ہندوستانی یوروپ اور امریکہ آنے جانے لگے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اکثر ہندوستانی خود ہندوستان کے بارے میں اتنا نہیں جانتے جتنا کہ یوروپ اور امریکہ کے بارے میں جانتے ہیں۔ اب ہم ان ملکوں کا حال لکھتے تو کون سا تیر مار لیتے۔ میرے ایک دوست پچھلے اٹھارہ برسوں سے لندن میں مقیم ہیں۔ ایک دن وہ ہمیں ایک پب (Pub) میں لے گئے۔ پب کا نام سن کر ہم نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا کہ انگریزی کا مایۂ ناز ادیب چارلس ڈکنس اس پب میں بیٹھا کرتا تھا۔ انہیں یقین نہ آیا۔ لیکن ہوٹل کے منیجر سے جب توثیق ہوئی تو بے پناہ خوش ہوئے۔ لندن میں ہمارے قیام کے دنوں میں وہ ہمیں اکثر ساتھ رکھتے تھے تاکہ لندن کے بارے میں ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ اس سفرنامہ میں لندن کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن یہ حال بھی ان لوگوں سے متعلق ہے جن کی مادری زبان اردو ہے اور جنہوں نے لندن کو مغرب میں اردو کا ایک مرکز بنا دیا ہے۔ سفرنامہ لندن میں شامل تفصیلات دراصل اردو کی ایک نئی بستی کی تفصیلات ہیں۔ امریکہ میں بھی ہمیں اردو والوں کی صحبت میں ہی رہنے کا موقع ملا۔ یہاں بھی اردو والوں نے ہمیں اتنا مصروف رکھا کہ کسی شریف امریکی سے بات چیت کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔

اکتوبر ۱۹۸۶ء میں ہم نے مرحوم سوویت یونین کا دورہ کیا۔ اس سفر میں ہمیں تاشقند، سمرقند، بخارا، ماسکو اور لنینی گراڈ (موجودہ پیٹروگریڈ) جانے کا موقع ملا۔ دورہ سوویت یونین میں ہم نے ازبکستان کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا۔ ماسکو اور لنینی گراڈ کا حال اس لئے گول کر گئے کہ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ سوویت نظام کا اب چل چلاؤ ہے۔ گورباچوف نئی نئی ''اصلاحات'' کے ذریعہ اس نظام کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ ہم لنینی گراڈ کا حال تفصیل سے نہ

لکھ سکے۔ دنیا میں ہم نے اب تک جتنے بڑے شہر دیکھے ہیں ان میں ہمیں یہ سب سے خوب صورت شہر نظر آیا۔ لیکن اس شہر سے ہمارا جی اس وقت کھٹا ہو گیا جب آدھی رات کو ہمارے ہوٹل کے کمرہ پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ (اس ہوٹل میں عام آدمیوں کا داخلہ سخت ممنوع تھا) ہم نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ اکیس بائیس برس کی ایک خوبصورت روسی لڑکی اپنے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ سجائے کھڑی ہے۔ پھر اس نے انگریزی اور روسی دونوں زبانوں کی ملاوٹ کرتے ہوئے ہم سے پوچھا "آپ کے پاس ڈالر ہیں؟"

ہم نے کہا "نہیں ہیں۔"

پوچھا "اسکاچ وہسکی اور امپورٹڈ سگریٹ ہیں؟"

ہم نے کہا "یہ بھی نہیں ہیں۔"

بولی "کچھ روبل تو ہوں گی ہی؟"

ہم نے کہا "وہ بھی نہیں ہیں۔"

قدرے توقف کے بعد بولی "آپ مسافر ہیں۔ تھک گئے ہوں گے۔ اگر آپ زلفوں کی چھاؤں اور پلکوں کے سایہ میں کچھ دیر گزارنا چاہیں تو بندی حاضر ہے۔ کیا میں آپ کے کمرہ میں آسکتی ہوں۔؟"

ہم نے انگشت شہادت سے اسے خاموش کراتے ہوئی سرگوشی کے انداز میں کہا "آپ اس وقت ہمارے کمرے میں بالکل نہیں آسکتیں کیونکہ ہمارے کمرے میں ایک اور روسی لڑکی پہلے ہی سے موجود ہے جسے ہم ڈالر اور امپورٹیڈ سگریٹ وغیرہ دینے میں مصروف ہیں۔ بی بی آپ نے یہاں آنے میں ذرا دیر کر دی۔"

وہ غصہ میں کسی اور کمرہ کی طرف چلی گئی۔ بعد میں اس معصوم کو ڈالر ملے یا نہیں یہ معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ ہمیں یہ ضرور پتہ چل گیا تھا کہ سوویت نظام کا دم اب نکلا ہی چاہتا ہے۔ دوسرے دن ہم نے ہندروس دوستی انجمن کے عہدیداروں سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ لن لینڈ یہاں سے

بہت قریب ہے اور خلیج فن لینڈ کے راستہ طرح طرح کی اشیائے تعیش یہاں اسمگل ہونے لگی ہیں اور یوں سوویت معاشرہ کو برباد کیا جارہا ہے۔ اب ہم انھیں کیا سمجھاتے کہ اس میں بیچاری خلیج فن لینڈ کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا کہ خود کورباچوف صاحب کا ہے کیونکہ خلیج فن لینڈ کے راستے تو صرف اشیائے تعیش ہی اسمگل ہوتی ہیں جب کہ کورباچوف صاحب تو سالم امریکہ کو سوویت یونین میں اسمگل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہوا بھی یہی۔ روس سے واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد سارا سوویت نظام مٹی کے ایک گھروندے کی طرح گر گیا۔

لینن گراڈ میں ہمیں ایک ضروری کام اس وقت یاد آیا جب لینن گراڈ کو چھوڑنے میں صرف دو گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ ہم نے رات میں نو بجے اپنی مترجم سے کہا، ''محترمہ! آپ نے ہرمیتاج (Hermitage) کی سیر کرائی۔ دوسری جنگ عظیم میں ہزاروں کی تعداد میں مرنے والوں کے اجتماعی قبرستان کی بھی زیارت کرائی مگر ہماری ایک چھوٹی سی خواہش رہی جاتی ہے۔ آپ کا مشہور ادیب دوستوفسکی لینن گراڈ میں ہی کہیں دفن ہے۔ ہم اس کی قبر پر حاضری دینا چاہتے تھے''۔ یہ سنتے ہی ہماری مترجم نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر فوراً کھڑا کیا اور کہا ''جلدی کیجئے، فٹافٹ۔'' دو منٹ بعد ہم بھاگتے بھاگتے ہوٹل کے باب الداخلہ پر پہونچے۔ مترجم نے باہر سے کچھ جھانک کر دیکھا۔ پھر بولی ''معاف کیجئے۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ جس قبرستان میں دوستوفسکی دفن ہے اس کا دروازہ ابھی بند ہوا چاہتا ہے۔ وہ دیکھئے چوکیدار قبرستان کا دروازہ بند کر رہا ہے۔'' چار دن ہم لینن گراڈ میں اپنے محبوب ادیب کی آخری آرام گاہ کے بالکل سامنے رہے لیکن کسی نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ دوستوفسکی یہاں دفن ہے۔ یوں بھی اس دھرتی میں صدیوں سے اتنے لوگ دفن ہوتے آئے ہیں کہ کسے پرواہ کہ کون کہاں دفن ہے، کیوں دفن ہے اور کب تک دفن رہے گا۔ ہماری مترجم نے قبرستان کے اطراف لگی ہوئی سلاخوں میں سے ایک سفید سی قبر کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ رہی دوستوفسکی کی قبر۔ ہم نے قبرستان کے باہر کھڑے ہو کر اپنے محبوب ادیب کی روح کو خراج عقیدت پیش کیا اور چلے آئے۔ غرض ایسی ہی کئی باتیں ہیں جو اس سفرنامہ میں آنے سے رہ گئی ہیں۔ ہمیں ۱۹۸۸ء میں پاکستان اور ۱۹۸۹ء میں سعودی عرب جانے کی بھی

سعادت نصیب ہوئی۔ ملکوں ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ملکوں اور جغرافیائی حالات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اصل اہمیت اُن انسانوں کی ہے جو اِن ملکوں میں آباد ہیں۔ ہمیں یہ بکھرے سفرنامے اس لئے پسند ہیں کہ ان میں بعض کردار اور شخصیتیں محفوظ ہوگئی ہیں۔ انہیں ملکوں کے حال کے طور پر نہیں بلکہ ان انسانوں کے ذکر کے طور پر پڑھا جائے جو ان ملکوں میں آباد ہیں۔

200 ANKUR APTS.
PATPAR GANJ
DELHI-110092

مجتبیٰ حسین

۲۴/جون ۱۹۹۵ء

اودیس سے جانے والے بتا

صاحبو! عرصہ تین برس کا بیت گیا، جب ہم مشرق میں ابھرتے سورج کی دھرتی جاپان گئے تھے۔ اب ہم پھر پر تول رہے ہیں اور اب کی بار مغرب میں اس ملک کو جا رہے ہیں جس کی سلطنت پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں سورج کتنا تھک جاتا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ سفرِ جاپان کے بعد خواص الناس کا اصرار دن بدن بڑھتا جا رہا تھا کہ ہم کسی اور ملک کا رخ کریں تا کہ یہ جو ہم ہر محفل میں پان کی بجائے جاپان کو پیش کرتے رہتے ہیں، اس سے انہیں نجات ملے۔ کچھ دور اندیش احباب نہ جانے کب سے احتیاطاً اپنی جیبوں میں امام ضامن ڈالے گھوم رہے تھے کہ ہم ادھر عزم سفر کریں اور وہ اُدھر ہمارے بازو پر امام ضامن باندھ دیں۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ ہمارا ذوقِ سفر صرف امام ضامن سے نہیں بڑھتا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ٹوکیو میں ان امام ضامنوں کے ہاتھوں کسٹم والوں نے ہمیں خاصا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ کھوٹی چونیوں والے امام ضامن تک کھلوا کر دیکھے تھے کہ کہیں ہم ان کے ملک میں چوری سے سونا تو اسمگل نہیں کر رہے ہیں۔ ایک کسٹم عہدیدار نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کیا تمہارے ملک میں ابھی تک منی پرس ایجاد نہیں ہوا ہے جو تم اس طرح رنگ برنگے کپڑوں میں بندھی ریزگاری کو اپنے بازوؤں پر باندھے لے جا رہے ہو۔ ہمارے ہاں ریزگاری پرس میں رکھی جاتی ہے۔ ایک اور کسٹم والے نے تو دورانِ تفتیش میں ہماری ٹانگوں کے اطراف بھی امام ضامنوں کو ڈھونڈنے کی سعی لاحاصل کی تھی اور بعد میں خاصا مایوس ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان امام ضامنوں کا اصل مقصد اگر اپنی دولت کو پوشیدہ رکھنا ہے تو اس دولت پوشیدہ کی صحیح جگہ ٹانگیں ہیں بازو نہیں کیونکہ پتلون کا گھیر قمیص کی آستین کے گھیر سے نہ صرف بڑا اور محفوظ ہوتا ہے بلکہ سیف ڈیپازٹ لاکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جتنے چاہو باندھ لو۔ خیر جو بات بیت گئی اس کا ذکر کیا۔ ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ

ہمارا ذوق سفر اس وقت تک نہیں بڑھتا جب تک کہ ہمیں کوئی اذوقہ ءسفر نہ دے۔ اردو کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کی طرح ہم بھی اب اعزازی زندگی گزارنے کے اہل ہو گئے ہیں یعنی دوسروں کے خرچ پر سفر کرنے کی عادت ہوگئی ہے بلکہ فرسٹ کلاس کا کرایہ طلب کر کے ماشاء اللہ سیکنڈ کلاس میں بھی سفر کرنے لگے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ منزل مقصود پر ہم ہمیشہ فرسٹ کلاس کے ڈبہ سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ تاہم اس معاملہ میں ہم اپنے دوست مائل مراد آبادی کی طرح اتنے اصول پرست بھی نہیں ہیں کہ موصوف اپنے سگے بھتیجے کی شادی خانہ آبادی میں شرکت کے لئے گئے تو آنے جانے کے کرایہ کے علاوہ سہرا پڑھنے کا وہی معاوضہ لیا جو عموماً مشاعروں میں شرکت کی خاطر لیتے ہیں بلکہ سہرے کی طباعت کا فرضی بل اپنے فرمانبردار بھتیجے کی خدمت میں الگ سے پیش کیا۔ اس قدر کٹر اصول پرست بننا اور ادب کی ایسی بے لوث خدمت کرنا ہمیں پسند نہیں۔ دنیا جانتی ہے اور ہمارا دل تو آج تک جانتا ہے کہ اپنی ہمشیرہ کی شادی میں اپنے پلے سے کرایہ دے کر گئے تھے۔ یہ ہمارا آخری سفر فی سبیل اللہ تھا۔

صاحبو! اب یہ جو ہم برطانیہ جا رہے ہیں تو اپنی ہمشیرہ کی شادی میں شرکت کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ ہمارے ذوق سفر کو اردو مجلس، برطانیہ نے مہمیز لگائی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اردو مجلس برطانیہ کے کارپرداز ان بیرسٹر غلام یزدانی، جناب عباس زیدی اور نقی تنویر (کہ تینوں حیدرآبادی ہیں اور وہاں کے نکالے ہوئے ہیں جہاں کے ہم بھی ہیں) کا ایک مشترکہ خط ہمیں وصول ہوا جس میں ادب میں ہمارے صحیح مقام و مرتبے وغیرہ سے خود ہمیں واقف کرانے اور ہماری ذات بے برکات کے بارے میں خاصی معلومات بہم پہنچانے کے بعد ہمیں مطلع کیا گیا تھا کہ برطانیہ کے اردو والے مخدوم محی الدین کو اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ اس بار ہم ذرا جم کر مخدوم کو یاد کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو بھی لگے ہاتھوں اس یاد میں شریک کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی معرفت حیدرآباد والوں کو بھی مخدوم کی یاد آئے اور اس طرح۔

الٰہی ختم نہ ہو یار غم گسار کی بات

اردو مجلس والوں نے آنے جانے کا ٹکٹ بھیجنے کے علاوہ ایک اضافی لالچ یہ بھی دیا کہ میاں یہاں آؤ تو ''یادِ مخدوم'' کے جلسے کی صدارت بھی تمہیں سونپتے ہیں۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ وطن میں بھلا کون اب مخدوم کو یاد کرتا ہے اور کون ہم سے جلسوں کی صدارت کراتا ہے۔ سو اب ہم کسی حد تک مخدوم کو یاد کرنے اور بڑی حد تک ایک جلسے کی صدارت کرنے کے لئے برطانیہ جا رہے ہیں۔

اب آپ سے کیا چھپانا کہ ماضی میں برطانیہ جانے کے کئی مواقع ہمارے ہاتھ آئے تھے مگر ہم نہیں گئے۔ دو چار مواقع تو ان کول میز کانفرنسوں کے تھے جن کا انعقاد آزادیٔ وطن سے پہلے ہوا تھا اور جن میں ہم صرف اس تجسس کی خاطر شرکت کرنا چاہتے تھے کہ دیکھیں کول میز کانفرنس کو صرف اس کی میز کی گولائی کی وجہ سے کول میز کانفرنس کہا جاتا ہے یا آزادی کو کول کرنے کے سبب سے اسے کول میز کانفرنس کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہم ان کول میز کانفرنسوں میں اس لئے نہیں گئے کہ اس وقت تک ہم نے پاؤں پاؤں چلنا بھی نہیں سیکھا تھا ورنہ ضرور چلے جاتے۔ انگریزوں کی بے جا عجلت پسندی پر اب بھی دکھ ہوتا ہے کہ اگر وہ کچھ دن اور ہماری خاطر برصغیر میں ٹک جاتے تو گاندھی جی کی آواز پر ہم بھی لبیک کہہ کر تعلیم ترک کرتے اور اس طرح آج ہمارا شمار بھی برِ بنائے جہالت، اکابرین میں ہوتا اور ہم آج اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے یوں جوتیاں چٹخاتے نہ پھرتے۔ برطانیہ جانے کا دوسرا موقع ہمیں اس وقت ملا تھا جب پرنس چارلس کی شادی ہونے والی تھی۔ ہم بہت دنوں تک دعوت نامہ کا انتظار کرتے رہے وہ نہیں ملا۔ تب یقین آیا کہ برطانیہ میں بھی ڈاک کا انتظام ہمارے انتظام سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ ایسا کیونکر نہ ہو جب کہ ہمارے دوست شمس الرحمٰن فاروقی ہندوستانی ڈاک سے وابستہ ہیں اور برطانیہ کے محکمۂ ڈاک میں ہمارے بچپن کے دوست نقی تنویر کام کرتے ہیں۔

صاحبو! ایک زمانہ تھا جب اختر شیرانی ولیس سے آنے والے ہر آدمی سے یاران وطن کا حال پوچھا کرتے تھے۔ اب ولیس سے جانے والا یاران وطن کا حال سناتا ہے کیونکہ اکثر یاران وطن

نے اب وطن سے بہت دور اپنی بستیاں بسا رکھی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے بچپن کے سارے دوست برطانیہ میں اور نوجوانی کے دوست امریکہ میں خیریت سے ہیں، ان سے ذرا پختہ عمر کے دوست مشرق وسطیٰ کے ممالک میں عربوں کے تیل اور اپنی زندگی کے تیل کے خاتمے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس طرح ہمارا بچپن برطانیہ میں مچل رہا ہے، ہماری نوجوانی امریکہ میں مہک رہی ہے اور ہمارا ادھیڑ پن مشرق وسطیٰ میں اونگھ رہا ہے۔ وطن میں تو اب ہمیں اپنے بڑھاپے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ گویا ہم برطانیہ نہیں جا رہے ہیں بلکہ اپنے بچپن کی طرف جا رہے ہیں۔

آیا یارانِ رفتہ آیا آیا

اس بچکانہ استدلال سے قطع نظر ہمارے دیر سے برطانیہ جانے کی کچھ اور معقول وجوہات بھی ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہم اردو گزیدہ ہیں۔ ہر کام اردو کے حوالے سے کرتے ہیں۔ کسی کو دھوکہ بھی دینا ہو تو اسی شیریں زبان میں دیتے ہیں۔ یوں بھی دھوکہ دینے کے لئے اس سے بہتر زبان کوئی اور نہیں ہے۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ برطانیہ کا اردو ماحول ہمارے معیار تک رسائی حاصل کر لے اور جب وطن عزیز میں اردو کے ختم ہونے کا گمان اور برطانیہ میں اس زبان کے پھلنے پھولنے کا یقین پختہ ہو جائے تو تب ہم سرزمین فرنگ پر قدم رنجہ فرمائیں۔ ماشاءاللہ برطانیہ میں اب اردو اور اردو کلچر کا خاصا بول بالا ہے۔ پچھلے دنوں برطانیہ کے ایک صاحب دہلی کی جامع مسجد کے سامنے ملے۔ کہنے لگے "میاں! دہلی میں اب صرف جامع مسجد رہ گئی ہے۔ اس کی سیڑھیاں تو اب لندن میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کی نہاری اب بریڈفورڈ میں ملتی ہے۔ یہاں کی کرخنداری اب برمنگھم میں سنائی دیتی ہے۔" برطانیہ میں مقیم ایک حیدرآبادی دوست نے ہمیں کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا "میاں! حیدرآبادی بریانی اور حیدرآبادی نہاری کھانی ہو تو لندن آ جاؤ۔ اس بریانی کی تلاش میں پتھر گٹی اور مچھلی کمان کے چکر کیوں لگاتے ہو۔ مچھلی کمان تو اب لندن میں آ گئی ہے۔"

ہمیں انگریزوں پر غصہ بھی آتا ہے کہ اول تو ہمارا کوہ نور ہمیں واپس نہیں کرتے اوپر سے جامع مسجد کی سیڑھیاں بھی وہیں منگوا لیں۔ کوہ نور تو خیر ہمیں واپس کر دیں البتہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کو

وہیں رہنے دیں کہ یہ وہاں زیادہ محفوظ ہیں۔

سنا ہے کہ لندن میں اب آل انگلینڈ مشاعرہ بھی منعقد ہوتے ہیں۔ مقامی شاعروں اور بیرونی شاعروں کا چکر بھی وہاں چلتا ہے۔ اب انگلستان کے شاعروں کا موازنہ انیس و دبیر اور معرکۂ انشاء و مصحفی بھی ہونے لگا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ اردو ادب میں پنپنے کی یہی تو باتیں ہیں۔ پچھلے دنوں دہلی میں ہماری ملاقات برطانیہ کے ایک اردو شاعر ریاض برمنگھموی سے ہوئی تھی۔ دو گھنٹوں تک اپنا کلام ولایت نظام ہمارے گوش گذار کرنے کے بعد اپنے دو برطانوی شاعر دوستوں فیض بریڈفورڈوی اور آتش لیک ڈسٹرکٹوی کے مجموعہ ہائے کلام کے اعزازی نسخے بھی ہمیں سونپے اور خواہش کی ہے کہ ہم اپنی زرین رائے سے انہیں مطلع فرمائیں۔

خوب یاد آیا ہمارے دوست خلیق انجم نے کہ جو انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ہیں اور ابھی انگلستان سے واپس ہوئے ہیں ایک محفل میں یہ مژدہ جانفزا بھی سنایا تھا کہ برطانیہ کے آٹھ ہزار اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اگر برطانیہ کے آٹھ ہزار اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے تو انگریز بچوں کو انگریزی پڑھانے کے لئے اسکول کہاں سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ جب سے یہ سنا ہے ہمیں انگریزی زبان سے ہمدردی ہوگئی ہے۔ خلیق انجم جنہیں ہم انجمن ترقی اردو کی رعایت سے "خلیق انجمن" بھی کہتے ہیں اردو کے تعلق سے بڑا رجائی تصور رکھتے ہیں اور ہندوستان کے باہر اس کے مستقبل سے خاصے پر امید ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اردو کی صورت حال کو مزید پر امید ثابت کرنے کے لئے برطانیہ کے اردو اسکولوں کی صحیح تعداد بتانے میں تھوڑے بہت مبالغہ سے کام لیا ہو لیکن اتنا اعتبار تو ہم ان کے دعویٰ پر کرہی سکتے ہیں کہ بھلے ہی برطانیہ کے آٹھ ہزار اسکولوں میں اردو نہ پڑھائی جاتی ہو اسّی (۸۰) اسکولوں میں تو ضرور پڑھائی جاتی ہوگی۔ کبھی کبھی تقریر میں بھی تو "کتابت کی غلطی" ہوجاتی ہے۔

اردو سے قطع نظر برطانیہ جانے کی اور بھی کئی وجوہات ہیں۔ ہمیں لندن کی ان تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کی تمنا ہے جہاں بیٹھ کر انگریزوں نے اپنی تاریخ تو بنائی مگر دوسروں کا جغرافیہ

بگاڑا۔ ہمیں ان عمارتوں کے علاوہ اردو مزاح نگاری کے قطب مینار کو بھی دیکھنا ہے جو ان دنوں لندن میں واقع ہے۔ ہماری مراد حضرت مشتاق احمد یوسفی سے ہے۔ اس عمارت کا موجودہ حال بھی آپ کو لکھ کر بھیجیں گے۔ بیرسٹر غلام یزدانی اور عباس زیدی تو خیر ہمارے میزبان ہیں ہی جن کی ''اردو مجلس'' کا حال آپ اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ لندن میں ہمارے بچپن کے کئی احباب رہتے ہیں۔ نقی تنویر جو ہمارے ہمراز اور کبھی ہم ان کے ہمراز ہوا کرتے تھے پچھلے بائیس برس سے لندن میں مقیم ہیں لیکن ہر دم رگ جاں سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ وقار لطیف ہندوستان سے انگریزوں کے چلے جانے کے باوجود انگریزوں کی طرح رہتے تھے۔ انگریزی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ انگریزی میں بولتے تھے تو لگتا تھا کہ بی بی سی سے خبریں نشر کر رہے ہیں۔ آدمی گالیاں عموماً اپنی مادری زبان میں دیتا ہے۔ یہ گالیاں تک انگریزی میں دیتے تھے۔ جن کا بعد میں ہمیں کسی سے ترجمہ کروانا پڑتا تھا۔ انگریزی کی بہت سی گالیاں ہم نے انہیں سے سیکھیں۔ خاصی بے ضرر گالیاں ہیں جن سے اس زبان کا جس میں کہ یہ دی جارہی ہوں اور اس شخص کا جس کو یہ دی جارہی ہوں کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

ہمارے دوست حسن عسکری ہیں جن کے جانے سے ہندوستان میں ٹیکسی ڈرائیوروں کا کاروبار خاصا متاثر ہوا ہے۔ مشہور تھا کہ وہ اپنے ڈرائنگ روم سے اپنے ہی گھر کے باتھ روم میں بھی ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ اپنی باتوں سے علم کا دریا کچھ اس زور سے بہاتے تھے کہ ہم تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے۔

ڈاکٹر یوسف علی خاں اب خیر سے لندن میں ہیں جنہوں نے اردو ذریعہ تعلیم میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مریض اگر اپنے مرض کی کیفیت شائستہ اور بامحاورہ اردو میں بتانے سے قاصر ہوتا تو اس کا علاج نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے جب حیدرآباد میں اپنا مطب کھولا تو بشمول ہمارے تین چار اور دوستوں کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ ہم ان کے مطب میں آکر بطور مریض بیٹھا کریں تاکہ عوام الناس کو پتہ چلے کہ ان کے ہاں خاصے مریض آتے ہیں۔ بطور مریض ہماری مستقل

موجودگی سے اگر چہ ان کے مطب کی رونق میں خاصا اضافہ ہو جاتا تھا مگر بعد میں لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے کیونکہ پچھلے چار مہینوں سے چار مریض ہر روز پابندی سے ان کے مطب پر آتے ہیں لیکن اتنے لمبے علاج کے باوجود ان کے صحت یاب ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے بعد یوسف نے ہمیں مریض کے عہدہ سے برطرف کر دیا تھا۔

حبیب حیدر آبادی عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں۔ انہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو آج سے تیس برس پہلے ہم ان کی سوڈا لیمن کی دکان پر لیمن پینے اور انہیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ وہ دکان اپنی بڑھا گئے تو ہم نے بھی لیمن جیا ترک کر دیا۔

اکبر حیدر آبادی بھی آکسفورڈ میں بیٹھ کر شعر کہتے ہیں اور اتنے لمبے فاصلے کے باوجود اپنے شعروں سے دہلی میں ہمارا سر دھنواتے ہیں۔ مشہور محقق اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی بھی اکثر یاد آتے ہیں جنہوں نے غالب کو "حیدر آباد یا نے" کے لئے اقبال اور گوئٹے کی طرز پر ایک باضابطہ کتاب "غالب اور حیدر آباد" لکھی تھی۔ وہ جب سے ہندوستان سے گئے ہیں آثار قدیمہ میں ہماری دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔

ان حیدر آبادی احباب کے علاوہ کچھ پیارے غیر حیدر آبادی دوست بھی ہیں جن سے ملنے کو دل مچلتا ہے۔ ایک تو ہمارے کرم فرما ساقی فاروقی ہیں جن سے دس سال پہلے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس قدر ٹوٹ کر ملتے ہیں کہ ملنے والا ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ ان کی شاعری ہمیں بہت پسند ہے کیونکہ ان کی شاعری کو پڑھنے کے بعد آدمی کو چڑیا گھر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اپنے کئی احباب کی زبانی ان کے کچھوؤں اور بلیوں کی بھی بہت شہرت سنی ہے۔ اب ان کا دیدار بھی کریں گے۔ ان کے کئی مینڈک دہلی میں آباد ہیں، ہم بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔ ساقی فاروقی دو تین برسوں میں ایک بار اپنی جڑوں کی تلاش میں ہندوستان آتے ہیں۔ انہیں جڑیں ملتی ہیں یا نہیں یہ ہم نہیں جانتے البتہ ہندوستان میں ان کے ساتھ کچھ جڑی بوٹیوں کو ہم نے ضرور دیکھا ہے۔

افتخار عارف سے اگرچہ پچھلے سال دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس محبت سے ملے کہ اس کی گرمی سے اب تک ہمارا دل پگھلتا ہے۔ اردو مرکز برطانیہ کے سکریٹری ہیں۔ خوب صورت شعر کہتے ہیں اور ہمیں پیارے پیارے خط لکھتے ہیں۔ احمد فراز، سحاب قزلباش، زہرہ نگاہ، رضا علی عابدی، چاند کرن، سوہن راہی، راج کھیتی، دھرم پال، مجیب صدیقی اور شمس الدین آغا ان سب سے ہم جلد ہی ملیں گے۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ ہم برطانیہ جا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم اور ہمارے دل پر جو کچھ گزرتی رہے گی اسے رقم کر کے بھیجتے رہیں گے۔

● ● ●

سفر کرنا ہمارا مردانہ ہوائی جہاز میں

قارئین کرام! ہم دہلی سے اڑ کر خلا میں آ گئے ہیں اور ہر ہوائی سفر کی طرح اس بار بھی ہمیں کھڑکی کے برابر والی نشست ملی ہے۔ کچھ دیر تانک جھانک کرتے رہے کہ اس کی پرانی عادت ہے۔ جو عادت کے جاتے جاتے یا ہمارے جاتے جاتے ہی جائے گی۔ پالم کا ہوائی اڈا اب دو گھنٹے پیچھے رہ گیا ہے۔ ہم اب شاید وطن عزیز کی دھرتی سے بھی باہر نکل چکے ہیں۔ نیچے نہ جانے کون سا ملک ہے جس کی فضاؤں میں ہم اڑ رہے ہیں۔ کاش کہ ہم کوئی اہم شخصیت ہوتے اور اس ملک کی فضاؤں میں سے گذرتے ہوئے یہاں کے باسیوں کیلئے خیر سگالی، محبت اور عالمی امن وغیرہ کے پیغام روانہ کرتے۔ بھلے ہی کسی کو ہمارے جذبہ خیر سگالی کی ضرورت نہ ہو لیکن یہی تو وہ واحد جذبہ ہے جو حضرت جگر مرادآبادی کے بعد ہمارے پاس وافر مقدار میں موجود ہے۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

آدمی ایک بار بیرونی سفر پر ہو آئے تو پھر ہوشیار ہو جاتا ہے۔ ہمارا تین سال پرانا تجربہ بالآخر ہمارے کام آ رہا ہے۔ چنانچہ اس بار دہلی کے ہوائی اڈے پر صرف تین چہروں نے ہمیں وداع کیا۔ ہمارے حیدرآبادی دوست بشارت اللہ حسینی تھے کہ جنہیں ہمیں نہ صرف ہوائی جہازوں پر بلکہ ٹرینوں اور بسوں پر بھی وداع کرنے کا تجربہ ہے۔ اس وسیع تجربہ کے بعد وہ بھلا ہمیں خوشی خوشی وداع کرنے کیونکر نہ آتے۔ ہمارے نوجوان دوست عزیزی سخی حسن صدیقی بھی ہمیں رخصت کرنے کم آئے تھے اور ہم سے یہ وعدہ لینے زیادہ آئے تھے کہ ہم دورہ یوروپ و امریکہ سے فارغ ہونے کے بعد ان کے وطن مالوف امروہہ کا دورہ کریں گے۔ اگرچہ ہم نے ہاں کر دی ہے مگر انہیں کیا بتائیں کہ امروہہ کا دورہ کرنے سے پہلے ہمیں مغرب کے کئی فالتو ملکوں کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازنا ہے۔ ہماری نصف بہتر بھی اس بار ہمیں باوید نم وداع

کرنے کے لئے آئی تھیں۔ اس بار ان کی آنکھوں میں ہماری ''انگریزی دانی'' کے باعث زیادہ ہی آنسو تھے۔ کہہ رہی تھیں کہ جب تم جاپان گئے تھے تو مجھے یقین تھا کہ تمہیں جاپانی نہیں آتی۔ فساد کی اصل جڑ تو زبان دانی ہی ہوتی ہے۔ زبان یار ترکی ہو اور تم ترکی نہ جانو تو بیل منڈھے نہیں چڑھتی۔ لیکن اب کی بار میرا سکون قلب اس لئے متزلزل ہے کہ تم جن ملکوں میں جا رہے ہو وہاں انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے اور تم انگریزی نہ صرف بولتے ہو بلکہ سمجھتے بھی ہو۔ ہائے اللہ کیا کروں۔''

اب ہم انہیں کس طرح سمجھائیں اور کس زبان سے سمجھائیں کہ انگریزی جاننے کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ انگریزی بولنے کے لہجے کو سمجھنے کی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت ہم جس ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں اس میں بڑی دیر سے کچھ اعلانات ہو رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ چونکہ سیرین عرب ایئر لائنس کا طیارہ ہے اس لئے عربی میں اعلانات ہو رہے ہوں گے۔ ہم نے عربوں کی اپنی زبان سے محبت کی تعریف اپنے ساتھی مسافر سے کی تو اس نے کہا ''بندہ نواز! آپ کو خوش فہمی ہوئی ہے۔ یہ اعلانات انگریزی میں ہی ہو رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس انگریزی پر عربی لہجہ کا کلف چڑھایا جا رہا ہے۔ اس کا کلف ہٹا دیئے تو آپ کو انگریزی سنائی دے گی۔'' ہم نے بڑی دیر تک عربی لہجہ کے کلف کو ہٹانے کی سنجیدگی سے کوشش بھی کی مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک لفظ البتہ ہماری سمجھ میں آیا اور وہ ہے ''شارجہ۔'' قیاس اغلب ہے کہ ہمارا ہوائی جہاز شارجہ کی سمت جا رہا ہے۔ کہیں بھی جائے ہمیں ایک نہ ایک دن لندن ضرور پہنچا دے۔ بس یہی دعا ہے۔

صاحبو! سیرین عرب ایئر لائینس کے طیارے میں ہم پہلی بار سفر کر رہے ہیں۔ اس کی جو کچھ بھی شہرت سنی تھی طیارے میں بیٹھنے کے بعد درست ثابت ہو رہی ہے۔ ماشاء اللہ خاصا شرعی طیارہ ہے۔ زیادہ تر ہدایتیں عربی زبان میں ہی درج ہیں۔ ہماری نشست کے سامنے ایک عبارت عربی میں درج ہے ''قمیص النجات تحت المقعد۔'' خاصا وقت اس عبارت کے مطلب کو سمجھنے میں ضائع ہو گیا۔ چونکہ اردو کی معرفت تھوڑے بہت عربی الفاظ بھی جانتے ہیں اس لئے جیسے تیسے اس

عبارت کا مطلب نکال لیا ہے۔پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس چار لفظی عبارت میں جو چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ سب کے سب اردو میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔مگر ساری گڑبڑی عربی کے ''ال'' کی وجہ سے ہوگئی۔اس عبارت کا اردو میں لفظی ترجمہ تو شاید مناسب نہ ہوگا تاہم آپ کی سہولت کے لئے بتاتے چلیں کہ انگریزی میں اس کا ترجمہ (Life jacket under your seat.) ہوگا۔اس ترجمہ کو پڑھ کر آپ عربوں کی راست کوئی کے قائل ہو جائیں گے۔ایک اور خصوصیت ہمیں اس ہوائی جہاز کی یہ نظر آئی کہ خاصا مردانہ ہوائی جہاز ہے کیونکہ اس میں ایئر ہوسٹس قسم کی مخلوق ذرا کم ہی پائی جاتی ہے۔خطرے کے وقت ہوائی جہاز سے باہر کودنے اور آکسیجن کی مدد سے تنفس کو برقرار رکھنے کا عملی مظاہرہ بھی مردوں نے انجام دیا۔ہوائی حسینائیں جب بھی اس طرح کے عملی مظاہرے کرتی ہیں تو تب بھی ہمیں خطرہ کی صورت میں ہوائی جہاز سے باہر نکلنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آتا۔تاہم یہ عملی مظاہرہ آنکھوں کو بہت بھلا لگتا ہے۔ان کی جگہ سیرین عرب ایئر لائینس کے پہلوان نما اسٹیورڈس نے یہ عملی مظاہرہ کیا۔کھانا بھی ان ہی لوگوں نے اپنے کرخت ہاتھوں سے کھلایا۔دو تین خواتین طیارے میں ضرور نظر آئیں مگر وہ سگھڑ بیبیوں کی طرح اپنا زیادہ وقت باورچی خانہ میں گذارتی نظر آئیں۔مسکراہٹ بھی ان کے چہروں پر بالکل دکھائی نہ دی۔غالباً عربی میں مسکرا رہی تھیں۔اے کاش ہم بھی عربی جانتے تو ان کی مسکراہٹ کو سمجھتے۔

اس بار یوروپ کا سفر ہم خاصے اطمینان کے ساتھ کر رہے ہیں۔اس لئے کہ اس سفر میں ہمارے ساتھ دوستوں کی فرمائشوں کی لمبی فہرستیں نہیں ہیں۔تین سال پہلے ٹوکیو میں ہمارے حالات تو خیر اچھے رہے مگر حالت کچھ ایسی رہی کہ کسی بھی دوست کی فرمائش کی تکمیل نہ کر سکے۔اس وقت تو ہمیں اور ہمارے احباب دونوں کو خاصا ذہنی صدمہ پہنچا مگر اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس بار کسی دوست نے فرمائشوں کی فہرست نہیں دی۔ہم نے مردنا اپنے دوست بلراج ورما سے پوچھا بھی کہ بتائیے اس بار آپ کے لئے یوروپ سے کیا لے آئیں۔بولے ''میں نے تمہیں جو دو گرم سوٹ دینے تھے انہیں واپس لیتے آنا۔بھولنا مت۔بڑا احسان ہوگا۔'' ہمارے بزرگ

دوست بنارسی لال شرما کہ ہمارے کرم فرماؤں میں سے ہیں ہمیں وداع کرنے کے لئے آئے تو ہم نے ان سے بھی یہی سوال پوچھا۔ بڑی متانت کے ساتھ بولے "کیوں تکلف میں پڑتے ہو۔ پھر بھی تمہارا اصرار ہے تو میری ایک فرمائش یہ ہے کہ میں نے تمہیں جو سوٹ کیس دیا ہے اسے بحفاظت تمام واپس لیتے آنا۔" بہر حال اس بار دوستوں کے دیئے ہوئے سامان سفر سے لدے پھندے ہم پوری بے فکری کے ساتھ یورپ جا رہے ہیں۔ اگر یہ سامان چوری بھی ہو جائے تو ہمیں کوئی فکر نہیں کہ یہ ہمارا ذاتی سامان نہیں ہے۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتے ہیں رہزن کو

لیجئے صاحب! ہمارا قیاس بالکل صحیح نکلا اور ہم سچ مچ شارجہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں، آسمان کی بلندیوں سے نیچے جھانکتے ہیں تو ہر طرف صحرا ہی صحرا دکھائی دیتا ہے۔ اس صحرا میں شارجہ نہ جانے کیا کر رہا ہے مگر ہمیں شارجہ سے کیا لینا دینا ہے۔ مسافر ہیں دو گھڑی رک کر آگے کو نکل جائیں گے۔ ہم نے ہمت کر کے ایک شامی اسٹیورڈ کو بلایا۔ اس کی انگریزی پر سے عربی کے کلف کو اتارا۔ جتنا کلف اترا اس سے یہی پتہ چلا کہ ہم شارجہ میں کچھ دیر ٹھیکی لے کر دمشق جائیں گے۔ دمشق میں ذرا لمبی ٹھیکی لیں گے پھر معاہدہ میونخ والے میونخ سے ذرا سی چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے لندن جا اتریں گے۔

شارجہ کا ہوائی اڈہ آ چکا ہے۔ دور سے اس کی بناوٹ کچھ ایسی نظر آتی ہے کہ اس پر ہم کو ہمارے ہاں کے کسی بزرگ کی درگاہ کا گمان ہوتا ہے۔ بڑی بڑی پر شکوہ گنبدیں اور اونچے اونچے جلیل القدر مینار۔ ہم تو خیر تاڑ گئے تھے کہ یہ ہوائی اڈہ ہے مگر ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے ایک باریش ہندوستانی بزرگ نے فوراً اپنے سر پر رومال رکھ لیا اور لگے فاتحہ پڑھنے۔ ان کے بیٹے نے کہ خاصہ جہاندیدہ نظر آتا ہے انھیں منع کرنے کی کوشش بھی کی مگر اس کے منع کرتے کرتے بھی بڑے میاں اپنے جوش ایمانی کے زیر اثر ہوائی اڈہ پر فاتحہ پڑھے بغیر نہ رہ سکے۔

صاحبو! اب اگلا حال لندن پہنچ کر ہی لکھیں گے۔

● ● ●

لندن میں ہمیں دفن کرنے کی تیاریاں

صاحبو! کون کہتا ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ یہ سب جھوٹ ہے فریب ہے۔ تین سال پہلے ٹوکیو جاتے وقت ہماری زندگی کے تقریباً چار گھنٹے ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ رات کے تین بجے دہلی سے چلے تھے تو ایک گھنٹہ بعد مرغ کی بانگ تو نہیں سنائی دی تھی البتہ سورج سمندر میں سے نکل آیا تھا۔ ہماری گھڑی میں ہندوستان میں دن کا ڈیڑھ بجا تھا تو ٹوکیو پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس وقت سے ہمیں اپنی عمر عزیز کے چار قیمتی گھنٹوں کے ضائع ہونے کا قلق تھا۔ اب تین سال بعد لندن گئے تو ہمیں اپنا کھویا ہوا قیمتی وقت واپس مل گیا۔ ہم صبح نو بجے دہلی سے چلے تھے۔ شارجہ میں کچھ دیر رک کر دمشق پہنچے تو سورج تب بھی سوا نیزے پر تھا۔ دمشق سے میونخ کی جانب روانہ ہوئے تو تب بھی سورج آن بان کے ساتھ چمک رہا تھا بلکہ میونخ کے آتے آتے تو عجب سماں تھا۔ بیچارا سورج غروب ہونے کے لئے بے چین تھا اور ہمارا طیارہ اسے ''شرف غروبیت'' عطا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بڑی دیر تک سورج اور طیارہ میں آنکھ مچولی جاری رہی۔ مگر سورج بالآخر سورج ہے۔ ہمارا طیارہ میونخ کے ہوائی اڈے پر اترا تو سورج نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور غڑاپ سے غروب ہو گیا۔ پھر جب ہم میونخ سے چل کر لندن کے ہوائی اڈے پر اترے تو ہماری گھڑی میں ہندوستانی وقت کے مطابق رات کا ڈیڑھ بجا تھا اور لندن کی گھڑیوں کو ابھی رات کے نو (۹) بجانے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ تین سال بعد ہمیں اپنا کھویا ہوا وقت نہ صرف واپس مل گیا بلکہ نفع میں ایک فاضل گھنٹہ بھی مل گیا۔ اب ہم ان پانچ فالتو گھنٹوں میں اردو

کی کچھ اور بھی خدمت کریں گے۔ اردو والے ہوشیار ہو جائیں۔

لندن کے ہیتھرو ائیر پورٹ پر اترنے سے پہلے ہم پر یوں بھی کچھ عجیب سی ہیبت طاری تھی کیونکہ ہم اس ملک میں قدم رنجہ فرما رہے تھے جہاں کے شیکسپیر، ورڈسورتھ، بائیرن، شیلے، کیٹس، ڈکنس، برنارڈ شا اور بہت سے دوسرے ادیب، جن کے نام ہمیں فی الحال یاد نہیں آ رہے ہیں، کی دھاک ہم پر بچپن سے بیٹھی ہوئی ہے۔ شخصیتیں جب کسی ملک سے بڑی ہو جاتی ہیں تو ملک بھی خواہ مخواہ بڑا نظر آنے لگتا ہے۔ ہیتھرو کے صاف ستھرے ائیر پورٹ پر اتر کر ہم امیگریشن کی لائن میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ ہم سے اگلے مسافروں سے طرح طرح کے سوالات پوچھے جا رہے تھے کہ لندن کیوں آ رہے ہو؟ کسی اور جگہ کیوں نہیں گئے؟'' کب تک قیام کا ارادہ ہے؟ لندن میں قیام کے اخراجات کون بیوقوف برداشت کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ امیگریشن کے کئی عہدیدار تھے اسی لئے ہم یہ سوچتے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں ہمیں کونسا عہدیدار بھگتانا ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہمارے حصہ میں آنے والا امیگریشن عہدیدار خود بھی مزاح نگار ہوگا۔ اس نے ہمارا پاسپورٹ دیکھنے کے بعد ہم سے لندن آنے کی غرض و غایت پوچھی۔ ہم نے کہا ''اردو مجلس (برطانیہ) کی دعوت پر لندن آئے ہیں۔ جلسوں وغیرہ کی صدارت کریں گے۔ کچھ اپنی سنائیں گے کچھ آپ کی سنیں گے اور اپنے ملک کو واپس چلے جائیں گے۔ یہ رہا اُردو مجلس کا دعوت نامہ۔'' اس نے دعوت نامے کو غور سے دیکھ کر کہا ''یہ اردو مجلس کیا ہے۔؟'' کہا ''لندن کے اردو بولنے والوں کی ایک تنظیم ہے۔''

پوچھا ''اردو سے آپ کا کیا تعلق ہے؟''

ہم نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا ''تعلق کی بھی خوب رہی۔ بھیا اس زبان کے مایہ ناز ادیب ہیں اور ساری زندگی اس زبان کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ اب آپ کے ملک میں بھی تھوڑی سی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔''

پوچھا '' آپ ادھر ہمارے ملک میں آئیں گے تو اُدھر آپ کے ملک میں اردو کی خدمت کون

انجام دے گا؟"

ہم نے کہا "آپ اس کی فکر نہ کریں۔ دو سو برس تک آپ ہماری فکر کر کے دبلے ہوتے رہے۔ یوں بھی ہمارے ملک میں دس بارہ ہزار افسانہ نگار اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ شاعر پہلے ہی سے اس زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم ادھر آ جائیں گے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا "یہ بتایئے آپ کتنے عرصے تک لندن میں اردو کی خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

ہم نے کہا "یہی کوئی ایک مہینہ تک آپ کے ملک میں اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔"

پوچھا "ایک مہینہ تک آپ لندن میں اس زبان کی خدمت کریں گے تو کیا اتنی خدمت اس زبان کے لئے کافی ہوگی۔ لگتا ہے آپ بہت زیادہ خدمت انجام دیتے ہیں۔"

ہم نے کہا "ذرہ نوازی کا شکریہ۔ لیکن ہمیں لندن میں بہت زیادہ خدمت انجام دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ کے ملک میں بھی کم از کم ہزار ڈیڑھ ہزار افسانہ نگار اور پانچ چھ ہزار شاعر اس زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔"

اس نے ہنس کر کہا "جب اس زبان کے اتنے سارے خدمت گزار خود برطانیہ میں موجود ہیں تو آپ نے یہاں آنے کا تکلف کیوں کیا؟"

اس کے اس اچانک اور غیر متوقع سوال پر ہمیں تشویش ہونے لگی۔ ہمیں لگا کہ اس کی نیت اچھی نہیں ہے اور ہمیں اپنے ملک میں آنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا۔ لہٰذا ہم نے آخری حربہ کے طور پر اپنے دوست نقی تنویر کا وہ حلفیہ بیان پیش کر دیا جس کے بارے میں نقی تنویر نے ہمیں لکھا تھا کہ اگر اردو مجلس کے دعوت نامے کی بنیاد پر امیگریشن والے تمہیں ویزا دینے میں ٹال مٹول کریں تو میرا یہ حلف نامہ ان کی خدمت میں پیش کر دینا۔ اس حلف نامے کی رو سے لندن میں تمہارے قیام اور تمہاری ذات سے متعلق سارے اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ ہم اپنے دوستوں کے بیان پر چاہے غیر حلفیہ ہی کیوں نہ ہو ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر

لیتے ہیں۔ چنانچہ خود ہم نے اس بیان کو پہلے سے نہیں پڑھا تھا۔ عہدیدار مذکور اس حلف نامے کو پہلے غور سے پڑھتا رہا۔ پھر بولا ''آپ بھی عجیب آدمی ہیں اور لوگ تو لندن میں آباد ہونے کے ارادے سے آتے ہیں اور آپ یہاں بہ نفس نفیس آ کر دفن ہونا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کے ملک میں دفن ہونے کی سہولت بھی نہیں ہے۔؟''

ہم نے آنکھیں پھاڑ کر کہا ''نعوذ باللہ! ہم آپ کے ملک میں کیوں دفن ہونے چلیں۔ دفن ہونے کے لئے ہمارے ملک سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہے۔ آپ نے ہمارے عالیشان مقبرے نہیں دیکھے کہ کس اہتمام سے مردے کو دفن کیا جاتا ہے۔ تبھی تو آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ویسے کفن دفن والا آپ کا سوال ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔''

اس نے نقی تنویر کا حلف نامہ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''آپ نے اپنے دوست کا حلف نامہ غالباً نہیں پڑھا ہے۔ اگر پڑھ لیتے تو لندن نہ آتے۔ آپ خود پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ تب ہمارا سوال آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔''

اب جو ہم نے حلف نامہ کو پڑھنا شروع کیا تو ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ نقی تنویر کے حلف نامے کا متن کچھ اس طرح تھا، ''میں نقی تنویر بہ قائمی ہوش وحواس اپنا یہ حلفیہ بیان قلمبند کراتا ہوں کہ میرے دوست مجتبیٰ حسین کے لندن میں قیام کے سارے اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوگی۔ میں مزید یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر لندن میں مجتبیٰ حسین کا انتقال ہو جائے تو میں یا تو ان کی نعش کو ہندوستان روانہ کرنے کا بندوبست کروں گا یا پھر برطانیہ میں ہی کسی موزوں جگہ پر ان کی تدفین کا انتظام کروں گا۔ اور یہ سارے اخراجات میں خود برداشت کروں گا۔''

امیگریشن عہدیدار نے ہمارے چہرے پر خوف اور پریشانی کے آثار کو بھانپ کر کہا ''مسٹر حسین! آپ کے دوست کی نیت اچھی نہیں ہے۔ کیا آپ اب بھی لندن شہر میں جانے کی اجازت لینا چاہیں گے یا واپسی کا ارادہ ہے؟''

ہم نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا" آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ان دنوں دوست اور دشمن میں تمیز کرنا بہت دشوار ہے۔ یہ ذات شریف میرے بچپن کے دوست ہیں اور ذرا دیکھئے کہ میرے تعلق سے ان کے ارادے کتنے خطرناک ہیں۔ ویسے اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ مجھے ویزا دیں یا نہ دیں۔" امیگریشن عہدیدار نے ہنس کر کہا" اب تو آپ کو ویزا ضرور دوں گا۔ یہ میری مجبوری ہے کیونکہ آپ تو مر کر بھی برطانیہ کا کچھ بگاڑنا نہیں چاہتے۔" اس نے دھڑ سے پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگادی پھر آنکھ مار کر بولا" مسٹر حسین! ایک بات یاد رکھئے۔ اگر آپ کا دوست کسی کو دفن کرنا ہی چاہتا ہے تو میری یہ خواہش ہے کہ وہ آپ کو دفن نہ کرے بلکہ اردو کو دفن کردے کیونکہ اردو کو دفن کرنے یا اس کی نعش کو ہندوستان روانہ کرنے میں اتنے اخراجات نہیں آئیں گے جتنے کہ آپ کو یہاں دفن کرنے میں آئیں گے۔ میں تو آپ کے اور آپ کے دوست کے فائدے کی بات کررہا ہوں۔"

ہم اپنا پاسپورٹ لے کر بوجھل قدموں سے وہاں سے نکل گئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم اپنے کندھوں پر خود اپنی نعش کو اٹھائے جارہے ہیں۔ سامان واپس کرنے والے بیلٹ پر جا کر اپنا سامان اٹھایا۔ پھر خودکار راستے پر سامان سمیت اپنی میت کو جتن سے کھڑا کیا اور آگے کو نکل گئے۔ دو ایک جگہ ہیتھرو ائیرپورٹ پر اردو میں بھی مسافروں کے لئے ضروری ہدایات نظر آئیں کہ ائیرپورٹ صاف ستھرا رکھئے یعنی سگریٹ کے ٹکڑے نہ پھینکو، مونگ پھلی کے چھلکے نہ بکھراؤ۔ براہ کرم اپنا تھوک اپنے منہ ہی میں رکھو وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ ہیتھرو ائیرپورٹ پر اردو عبارت کو پڑھ کر وہ والہانہ مسرت حاصل نہ ہوئی جو خود ہندوستان میں کبھی اردو عبارت کے نظر آجانے پر حاصل ہوتی ہے۔ یوں بھی صفائی سے متعلق اردو میں اس عبارت کو درج کرنے کا مقصد اردو کی اہمیت کو تسلیم کرنا نہیں تھا بلکہ اس طرح صفائی کے تعلق سے اردو والوں کی شہرہ آفاق عادات واطوار کو دنیا والوں پر اجاگر کرنا تھا ورنہ کیا وجہ ہے کہ اس غیر ضروری ہدایت کو چھوڑ کر بقیہ ساری ضروری ہدایتیں اردو میں درج نہیں تھیں۔

ہیتھرو ائیر پورٹ پر ہدایات اتنی واضح ہوتی ہیں کہ کوئی مسافر راستہ بھٹکنا چاہے تو تب بھی بھٹک نہیں سکتا۔ یہاں بھٹکنے کے لے بہت محنت اور جستجو کرنا پڑتی ہے۔ یوں بھی ہمیں پتہ تھا کہ یہ سارے راستے ہمیں مقتل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ تبھی تو یہ اہتمام ہے۔ ہم ٹرالی پر اپنا سامان رکھے کسٹم کے حلقہ سے باہر نکل آئے تو دیکھا کہ نقی تنویر ریلنگ سے لگے کھڑے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی خوشی سے ان کی باچھیں کھل اٹھیں اور ہم نے دل میں سوچا کہ ذرا دیکھو تو ظالم کو ہمیں دفن کرنے کی کتنی مسرت ہے۔ ہم باہر آئے تو نقی ہم سے بغلگیر ہونے کے لئے جتنا آگے بڑھتے تھے اتنا ہی ہم پیچھے ہٹتے جاتے تھے۔ ہم اصل میں یہ اطمینان کر لینا چاہتے تھے کہ کہیں نقی کے ہاتھ میں چھری چاقو تو نہیں ہے۔ بارے بغلگیری کا مرحلہ طے ہوا تو نقی نے کہا "بہت اداس اور بڑھال دکھائی دیتے ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

ہم نے کہا "ویسے تو سارے سفر میں چاق و چوبند رہے۔ ابھی ابھی تمہارے ہیتھرو ائیر پورٹ پر اترنے اور امیگریشن عہدیدار سے بات کرنے کے بعد ہماری یہ حالت ہوگئی ہے۔"

نقی نے کہا "امیگریشن والوں نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا؟"

ہم نے کہا "امیگریشن عہدیدار تو بہت بھلا آدمی تھا۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں شکایت تو ہمیشہ اپنوں ہی سے ہوتی ہے۔ خیر اس مسئلہ پر بعد میں بات کریں گے۔"

نقی نے کہا "آخر بات کیا ہوئی، یہ تو بتاؤ؟"

ہم نے کہا "ہمیں فوراً اس جگہ لے چلو جہاں تم نے ہمارے قیام کا بندوبست کیا ہے۔ اس وقت ہماری جذباتی اور نفسیاتی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ تنہائی میں کچھ دیر غور کرنا چاہتے ہیں۔ یوں بھی سولہ گھنٹہ کا سفر کر چکے ہیں۔"

نقی نے کہا "فوراً چلنا تو ناممکن ہے کیونکہ تمہارا طیارہ مقررہ وقت سے پچیس منٹ پہلے ہی لندن پہنچ گیا ہے اور ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بھی تمہیں رسیو کرنے کے لئے آئیں گے۔ وہ ماہر آثار قدیمہ ہیں۔ اپنے وقت پر آئیں گے۔ ان کا انتظار کرنا ضروری ہے۔"

ہم نے دل میں سوچا نقی کتنا خطرناک آدمی ہے۔ایک ماہر آثار قدیمہ کو بھی شریک جرم کرنا چاہتا ہے۔

اتنے میں ڈاکٹر شکیب آ گئے تو ہم نے انہیں جیسے تیسے ریسو کیا۔ڈاکٹر شکیب ان ماہرین آثار قدیمہ میں سے ہیں جو دوسروں کو آثار قدیمہ میں تبدیل ہوتے دیکھ کر تو بہت خوش ہوتے ہیں لیکن خود کو ہمیشہ جوان رکھتے ہیں۔چنانچہ ہمارے بالوں میں پھیلتی سفیدی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے ''اب تمہاری شخصیت معتبر ہوتی جارہی ہے۔'' ہم نے کہا ''زندگی کی آخری گھڑیوں میں آدمی میں اتنی معتبری تو آجاتی ہے۔'' نقی اور شکیب دونوں کو یہ فکر تھی کہ ہم ایئر پورٹ سے باہر نکل آئیں تو ہم لندن کی سردی کو کس طرح قبول کریں گے۔ہم نے کہا '' آپ حضرات ہماری فکر نہ کریں۔ دوستوں کی سرد مہری اور دلی کی سردی سے ہماری پرانی شناسائی ہے۔ہم دانتوں کو بجاتے ہوئے نقی کی کار میں بیٹھ گئے تو نقی نے اچانک ہمارے اطراف ایک بیلٹ کو باندھنا شروع کر دیا۔جب ہم سیٹ سے اچھی طرح جکڑ دیئے گئے تو ہمیں اچانک خیال آیا کہ یہ سب ہمیں ہلاک کرنے اور بعد میں دفن کرنے کی تیاریاں ہیں ورنہ کون اپنے جگری دوست کو اس طرح باندھتا ہے۔ہم سے رہا نہ گیا۔بولے ''یار نقی! تم ہمارے دوست ہو۔تمہارے لئے جان حاضر ہے۔ہم بیلٹ میں جکڑے بغیر ہی جان دے سکتے ہیں بلکہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تمہیں پیش کرنے کو تیار ہیں۔ہمیں معلوم ہے کہ تم ہمیں لندن میں دفن کرنے کا خطرناک ارادہ رکھتے ہو۔ مگر جان من پہلے لندن کو دیکھ لینے تو دو۔ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' نقی نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا ''اب سمجھ میں آیا کہ تم میرے حلف نامے سے خوفزدہ ہو۔یار میں نے تمہیں دفن کرنے کی بات صرف امیگریشن والوں کو مطمئن کرنے کیلئے لکھی تھی۔بچپن کے دوست ہو۔میری قسم پر بھروسہ کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ساری زندگی جھوٹی قسمیں کھاتے گذری۔رہی کار میں تمہیں بیلٹ سے باندھنے کی بات تو بھیا یہ یہاں کا دستور ہے۔بیلٹ نہ باندھو تو پچاس پونڈ جرمانہ ہو جاتا ہے اور لطف کی بات یہ کہ جرمانہ بیلٹ نہ باندھنے والے ہی سے وصول کیا جاتا ہے۔تم ابھی ابھی لندن آئے ہو۔تمہارے پاس جرمانہ ادا کرنے کے لئے پچاس پونڈ کہاں سے آئیں گے۔''

نقی کی بات کو سن کر دل کو کچھ اطمینان آیا۔ تاہم حفظ ماتقدم کے طور پر ہم نے ڈاکٹر شکیب کو گواہ بنا کر نقی سے یہ وعدہ لیا کہ خدانخواستہ اگر ہمیں کچھ ہو گیا تو وہ ہمیں لندن میں دفن نہیں کریں گے بلکہ ہماری نعش کو وطن عزیز کو روانہ کر دیں گے تاکہ وطن والے ہمارا ایک اچھا اور واجبی سا مقبرہ بنائیں۔ سال کے سال دھوم دھام سے ہمارا عرس وغیرہ منائیں۔ اس وعدہ کے بعد نقی کی کار لندن کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

● ● ●

قیام الدین کے گھر ہمارا قیام

صاحبو! وطن عزیز میں آج تک ہمیں کوئی اچھا پڑوسی نہ مل سکا۔ اسی لئے جب بھی ملک سے باہر جاتے ہیں تو ایک اچھے پڑوسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ٹوکیو میں ہمیں شہنشاہ جاپان کا پڑوسی بننے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ ماشاءاللہ بہت اچھے پڑوسی ثابت ہوئے۔ کبھی ہماری خیریت نہیں پوچھی اور نہ ہی کبھی شکر یا چائے کی پتی وغیرہ ہم سے منگوائی۔ لندن پہنچتے ہی ہمارے دوست نقی تنویر نے ہمیں بتایا کہ تین گھروں کے دروازے لندن میں ہمارے لئے کھلے ہیں۔ جہاں مناسب سمجھو وہاں قیام کرنا۔ ہم نے کہا "پہلے تو یہ بتا دو کہ ہمارے تعلق سے تمہارے اپنے گھر کے دروازوں کا کیا رویہ ہے؟"

بولے "تمہارے لئے تو میرے گھر کے دروازے اگر بند بھی ہوں تو توڑے جا سکتے ہیں۔ مگر میں خود بوجوہ ان دنوں اپنے ایک حیدرآبادی دوست قیام الدین کے ہاں مقیم ہوں۔ چاہو تو تم بھی وہیں قیام کر لینا۔"

ہم نے کہا "یار نقی تم قیام الدین کے ہاں قیام کرو یا طعام الدین کے ہاں۔ آج کی رات تو ہمارا قیام و طعام وہیں رہے گا جہاں تم قیام کر رہے ہو۔ چاہے یہ گھر قیام الدین کا ہی کیوں نہ ہو۔ بس شرط یہ ہے کہ اڑوس پڑوس اچھا ہونا چاہیے۔"

بولے "قیام الدین ہمپسٹیڈ میں رہتے ہیں اور تنہا رہتے ہیں۔ ہمپسٹیڈ لندن کا مشہور علاقہ ہے۔ ویسے تو لندن (۷۰۰) مربع میل پر پھیلا ہوا ہے لیکن سیاحوں کا لندن یعنی اصل تاریخی لندن جنوب میں چیلسی سے ہمپسٹیڈ تک پانچ میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ ہمپسٹیڈ لندن کا ایک قدیم اور تاریخی علاقہ ہے۔ اس کے چپہ چپہ پر برطانیہ کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ یہاں شرفا اور

مہذب لوگ رہتے ہیں۔ انگریزی کے مشہور شاعر کیٹس یہیں رہتا تھا۔ برطانوی مفکر ہیرالڈ لاسکی بھی یہیں رہتے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور لندن آئے تھے تو اسی علاقہ میں فروکش ہوئے تھے۔"

ہم نے کہا" یہ تو تم ماضی کے پڑوسیوں کا ذکر کر رہے ہو۔ حالیہ پڑوسیوں کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔" بولے "مشہور لیبر لیڈر مائیکل فٹ ہماری گلی کے نکڑ پر رہتے ہیں روز صبح کو یہیں دوڑ لگاتے ہیں۔ چاہو تو تم بھی ان کے ساتھ دوڑ لگانا اور ہاں ایک بات اور بتا تا چلوں کہ ہیمپسٹیڈ میں جس قسم کا حسن دکھائی دیتا ہے وہ لندن کے کسی علاقے میں دکھائی نہیں دیتا۔"

ہم نے کہا" حسن کا ہمارے سامنے ذکر نہ کرو۔ دیسی حسن نے دل پر جو گھاؤ لگائے ہیں وہی کیا کم ہیں کہ اب ہم بدیسی گھاؤ سے اپنا سینہ چھلنی کراتے پھریں۔" سو ہم اچھے اور حسین پڑوسیوں کے ساتھ ہیمپسٹیڈ میں اپنے حیدرآبادی دوست قیام الدین کے گھر مقیم ہو گئے۔ قیام الدین سے اگرچہ ہماری ملاقات لندن میں ہوئی لیکن یوں لگتا ہے جیسے وہ ہمیں اور ہم انہیں جنم جنم سے جانتے ہوں۔ وجہ اس کی غالباً یہ تھی کہ انہوں نے اپنی جوانی جن گلیوں میں کھوئی ہے وہیں کہیں ہم نے بھی اپنی جوانی کسی قدر تاخیر سے کھوئی ہے بلکہ اب بھی موقع ملتا ہے تو اپنی بچی کھچی جوانی یہیں کھونے جاتے ہیں۔ قیام الدین پچھلے بائیس برسوں سے لندن میں مقیم ہیں۔ لندن کے کسی سرکاری دفتر میں کام کرتے ہیں۔ ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے ریٹائر ہو چکے ہیں بلکہ نقی تنویر کا بیان ہے کہ ہماری آمد کے پیش نظر ہی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی لندن میں ایک ایسے ریٹائرڈ آدمی کی ضرورت تھی جس کی معیت میں ہم لندن کی گلیوں کی خاک وغیرہ چھان سکیں۔ تیسری منزل پر ان کا یہ خوبصورت فلیٹ ہے جس میں ہم مقیم ہیں۔ ایک ہی طرز پر بنے ہوئے تین منزلہ فلیٹ بہت خوبصورت لگتے ہیں۔

ہم نے قیام الدین سے کہا" آپ کو لندن کی تاریخ سے خاصی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ تبھی تو آپ نے ایک تاریخی محلہ میں مکان لے رکھا ہے۔"

ہمارے اس سوال کے جواب میں قیام الدین نے اپنے ڈرائینگ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا

اور پوچھا ''اس منظر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

ہم نے دیکھا دور دور تک چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں جن پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکان بنے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ انواع واقسام کے درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے ہیں۔ ہم اس منظر کی دلفریبی میں کھونے والے ہی تھے کہ قیام الدین نے پھر پوچھا ''آپ نے بتایا نہیں کہ اس منظر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

ہم نے منظر میں مزید ڈوبتے ہوئے کہا ''بہت اچھی رائے ہے۔''

بولے ''میں آپ کی اچھی یا بری رائے جاننا نہیں چاہتا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا منظر آپ نے اس سے پہلے کہیں دیکھا ہے؟''

ہم نے بے خیالی میں کہہ دیا ''جاپان میں دیکھا ہے۔''

بولے ''جاپان کو مارئیے گولی۔ کیا آپ کو یہ منظر ہمارے بنجارہ ہلز کی طرح دکھائی نہیں دیتا؟'' ہم نے ان کا دل رکھنے کے لئے ہاں میں ہاں ملائی تو بہت خوش ہوئے۔ پھر ہمیں اپنے باورچی خانہ میں لے گئے۔ باورچی خانہ کی کھڑکی کھولی تو ہمیں سامنے ہی ایک بڑا سا درخت نظر آیا۔ درخت کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولے ''بتائیے یہ کونسا درخت ہے؟''

ہم کوئی ماہر نباتیات تو ہیں نہیں بلکہ ہمیں تو آم کے پیڑ اور امرود کے پیڑ میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ کسی پیڑ کو اس وقت تک پہچان نہیں سکتے جب تک کہ اس پر پھل نہ لگ جائے۔ ہم نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا ''مضروری کوئی حیدرآبادی درخت لگتا ہے، غالباً املی کا درخت معلوم ہوتا ہے۔''

بولے ''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اگرچہ یہ املی کا درخت نہیں ہے لیکن ہو بہو املی کے درخت کا سا لگتا ہے۔ املی میں اتوار کے اتوار ساوتھال سے لاتا ہوں۔ اس درخت کو دیکھ کر سالن میں املی ڈالتا ہوں تو املی کی کھٹاس میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور حیدرآباد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔''

املی، املی کے پیڑ اور املی کی کھٹائی کی معرفت حیدرآباد سے قیام الدین کی جذباتی وابستگی کا

اندازہ لگانے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم لندن آنے کے باوجود حیدرآباد ہی میں مقیم ہیں۔ اگرچہ ہم نے لندن کی گلی گلی کی خان چھانی ہے لیکن اس کے باوجود اگر آپ کو یہ محسوس ہو کہ ہم نے لندن کو اس طرح نہیں دیکھا جس طرح کہ ہمیں دیکھنا چاہئے تھا تو اس میں قصور ہمارا نہیں قیام الدین کا ہے۔ ہم دن میں زیادہ تر ان ہی کے ساتھ لندن کی سیر کو نکلتے ہیں۔ رات کی سیر میں البتہ انہیں ساتھ نہیں رکھتے کیونکہ اس میں ان کی بھلائی کے علاوہ ہماری اپنی بربادی بھی مقصود ہے۔ وہ ہر لمحہ حیدرآباد کو نہ صرف یاد کرتے ہیں بلکہ ہم پر مثالوں کے ذریعہ یہ واضح کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ حیدرآباد، لندن سے زیادہ خوبصورت شہر ہے۔ ہم چونکہ ان کے مہمان ہیں اسی لئے ان کی بات مان لیتے ہیں۔

ہم نے لندن کا پہلا دن انہی کے ساتھ گذارا۔ ہمیں لندن کی سردی سے بچنے کے لئے فوراً ایک اوورکوٹ خریدنا تھا۔ قیام الدین نے کہا ''آکسفورڈ اسٹریٹ پر مارک اینڈ اسپنسر کے ڈپارٹمنٹل اسٹور سے خرید لیتے ہیں، اچھا اور سستا ملے گا۔''

نقی نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا ''وہ یہودیوں کا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے، وہاں سے ہرگز نہ خریدو۔ تمہارے اوورکوٹ خریدنے سے کہیں وہ اور بھی مالدار نہ ہو جائیں''۔

قیام الدین نے کہا ''یہودیوں کا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے تو کیا ہوا۔ یہ ایک ایسی سڑک پر واقع ہے جسے دیکھ کر حیدرآباد کی ایک سڑک یاد آجاتی ہے۔''

ہم انہیں کے ساتھ پہلے پہل لندن کی زیر زمین ٹرین ''ٹیوب'' میں بیٹھے۔ ہیمسٹیڈ سے پکاڈلی سرکس کا فاصلہ بمشکل بیس منٹ میں طئے ہوتا ہے۔ البتہ بوسٹن کے اسٹیشن پر ہمیں پکاڈلی جانے کے لئے سدرن لائن کو چھوڑ کر پکاڈلی لائن کی گاڑی پکڑنی پڑتی تھی۔ قیام الدین نے ہمیں بتایا کہ ہم ہمیشہ بوسٹن پر گاڑی بدل کر پکاڈلی لائن لیا کریں۔ یہ ہمارا پہلا دن تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا ''آج تو ہم آپ کے ساتھ ہیں جب اکیلے لندن کی سیر کو نکلیں گے تو بوسٹن کا خیال رکھیں گے۔ ہم نے تب تک برطانیہ کے رائج الوقت سکوں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ لہٰذا قیام الدین نے ہی

ہمارا ٹکٹ خریدا۔ ہم بوسٹن کے اسٹیشن پر پکاڈلی کا ٹکٹ لینے کے لئے قیام الدین کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے کہ ایک منزل پر قیام الدین نے تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ ہم بھی ان کے تعاقب میں بھاگنے لگے۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے بڑی عجلت کے ساتھ ایک کاؤنٹر سے ٹکٹ خریدا اور ٹکٹ چیکر کو دکھا کر پھرتی سے دوسری طرف کو نکل گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے جانے لگے تو ٹکٹ چیکر نے ہمیں روک لیا اور ہم سے ٹکٹ دکھانے کا مطالبہ کرنے لگا۔ ہم نے کہا ابھی جو صاحب تیزی سے اُدھر گئے ہیں انہوں نے ہمارا ٹکٹ آپ کو دیا ہوگا کیونکہ ہم تو انہی کے ساتھ ہیں۔"

ٹکٹ چیکر نے ہم سے کہا "معاف کیجئے! جو صاحب ابھی گئے ہیں انہوں نے آپ کا کوئی ٹکٹ نہیں دیا۔ میں مجبور ہوں۔ آپ کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

یہ سن کر ہمارے پیروں تلے سے بوسٹن کی زمین نکل گئی۔ ہماری جیب میں ایک پنس بھی نہیں تھی۔ سوچا اب یہیں رُک کے رہنے میں عافیت ہے کیونکہ مارک اینڈ اسپنسر کے ڈپارٹمنٹل اسٹور پر پہنچنے کے بعد قیام الدین ہمیں اپنے پیچھے نہیں پائیں گے تو وہ ضرور ہماری تلاش میں پھر بوسٹن اسٹیشن پر آئیں گے اور ہم انہیں کھڑے ہوئے مل جائیں گے۔ ہم نے نقی کا فون نمبر بھی اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا کہ اسے فون پر اپنی بپتا سناتے۔ مگر فون کرنے کے لئے بھی تو دس پنس کی ضرورت تھی۔ چار و نا چار ایک کونے میں کھڑے سوچتے رہے کہ قیام الدین پکاڈلی کی گاڑی میں بیٹھے جا رہے ہوں گے۔ اور اب انہیں پتہ چلا ہوگا کہ ہم ان سے بچھڑ گئے ہیں۔ لیکن اچھا خاصا منٹ بھی نہیں گذرے تھے کہ قیام الدین اپنی پتلون کو ٹھیک کرتے ہوئے ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔ ٹکٹ چیکر کو پار کر کے ہماری طرف آئے تو ہم نے کہا "آپ غالباً عجلت میں ہمارا ٹکٹ لینا بھول گئے تھے۔ ٹکٹ چیکر نے ہمیں اندر آنے نہیں دیا۔"

قیام الدین نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا "کیا آپ کو بھی آرہا ہے؟"

ہم نے کہا "آپ کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمیں کیا آرہا ہے؟"

بولے "بھئی! کیا آپ کو بھی پیشاب آرہا ہے؟"

ہم نے نفی میں جواب دیا تو بولے "میں تو پیشاب کرنے گیا تھا۔ جو ٹکٹ خریدا تھا وہ پیشاب کرنے کا تھا۔ آپ نے بتایا نہیں ورنہ میں آپ کا ٹکٹ بھی لے لیتا۔"

ہم نے پوچھا "کتنے کا ٹکٹ ہے؟"

بولے "بیس پنس کا۔"

ہم نے بیس پنس کو ہندوستانی سکہ میں تبدیل کیا تو جواب آیا تین روپے۔ (پندرہ روپے کا ایک پونڈ ہوتا ہے اور ایک پونڈ میں سو پنس ہوتے ہیں۔)

ہم نے کہا "قیام الدین صاحب ہمارا پیشاب اتنا قیمتی نہیں ہے بلکہ ہمارا تو کجا بھائی مرار جی دیسائی کا پیشاب بھی اتنا قیمتی نہیں ہوگا کہ ایک پیشاب پر تین روپے خرچ کریں۔ ہمارے ہاں تو اتنے روپیوں میں اتنی ہی مقدار کا کوئی اچھا سا شروب مل جاتا ہے۔"

ہنس کر بولے "اصل میں گھر سے نکلتے وقت میں پیشاب کرنا بھول گیا تھا اسی لئے عجلت میں جانا پڑا ورنہ میں ایسی فضول خرچی نہیں کرتا۔"

ہم نے کہا "یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر آپ نہ بھولتے تو ہمیں یہاں کے آٹے دال کا بھاؤ کیونکر معلوم ہوتا۔"

بولے "آپ بھی دلچسپ آدمی ہیں۔ اس میں آنا کہاں ہے اور دل کہاں ہے۔ لندن میں ہمیں پیشاب کرنے کے معاملے میں وہ سہولت حاصل نہیں ہے جو اپنے حیدرآباد میں حاصل ہے، جب ذرا گردن جھکائی کر دیا۔"

دعوات کے موضوع کو پھر حیدرآباد کی طرف لے جانے لگے تو ہم انہیں پکڑ کر پکاڈلی لائن کی طرف لے گئے۔ پکاڈلی سرکس کی پہلی سیر ہم نے قیام الدین کے ساتھ ہی کی۔ قیام الدین بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ صبح کو لمبی دوڑ لگا کر آتے ہیں۔ دوپہر میں پیراکی کرنے جاتے ہیں۔ شام کو ٹینس کھیلنے جاتے ہیں۔ اتنی ساری جسمانی ورزش کے بعد اتنا تھک جاتے ہیں کہ شام ہوتے ہی سو

جاتے ہیں۔ ہمارے لندن پہنچنے کے بعد انہوں نے سخت جسمانی ورزش کم کر دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تیسری منزل کے فلیٹ میں رہتے ہیں اور ان فلیٹوں کا صدر دروازہ کسی کے اندر آتے ہی خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص تیسری منزل پر رہنے والے سے ملنے آئے تو اس شخص کے لئے دروازہ کھولنے کی خاطر کئی سیڑھیاں اتر کر نیچے جانا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ پھر یہ اوپر بھی آنا ہوگا۔ ہم سے ملنے کے لئے اتنے لوگ آتے تھے کہ ہر گھنٹی کی آواز پر قیام الدین کو دروازہ کھولنے کے لئے کئی سیڑھیاں نیچے اتر کر جانا اور پھر اوپر آنا پڑتا تھا۔ دو چار دنوں تک تو ان کی دوڑ، پیرا کی، ٹینس اور سیڑھی چڑھائی ساتھ ساتھ جاری رہی۔ بعد میں ماشاء اللہ اتنی سیڑھیاں اترنے اور چڑھنے لگے کہ پہلے صبح کی دوڑ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بعد میں ٹینس کو خیرباد کہا اور پھر پیرا کی کو بھی تہہ کر کے رکھ دیا۔

ان کا ایک اور محبوب مشغلہ دوستوں کی دعوتیں کرنا اور حیدرآبادی کھانا پکانا ہے۔ جتنے اچھے اور لذیذ حیدرآبادی کھانے ہم نے قیام الدین کے ہاں کھائے کبھی خود حیدرآباد میں نہیں کھا سکے۔ حیدرآبادی بریانی، بگھارے بیگن، دہی کی چٹنی، کھچڑی، نہاری اور ٹماٹر کا کٹ وغیرہ تو بناتے ہی تھے مگر بعض اوقات بڑے دلچسپ کھانے بھی بنا دیتے تھے۔ ایک دن قطب شاہی قورمہ بنایا۔ بہت پسند آیا۔ ہم نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر پوچھا یہ قورمہ محمد قلی قطب شاہ کے دور کی پیداوار ہے یا عبداللہ قطب شاہ کے دور کی دین ہے۔ بولے "قطب شاہیوں کو لندن آنا ہی کب نصیب ہوا تھا کہ وہ یہ قورمہ کھاتے یا ایجاد کرتے۔ یہ قورمہ تو ایجاد بندہ ہے۔ وطن سے محبت کی خاطر اس قورمہ سے قطب شاہیوں کی نسبت جوڑ دی۔" ایک دن "آصفجاہی کوفتے" بھی بنائے تھے۔ بہت لذیذ تھے۔ ایک بار ہم عجلت میں کہیں جا رہے تھے۔ قیام الدین نے پوچھا "آج رات کیا کھانا چلے گا؟" ہم نے انہیں ٹالنے کے لئے کہا "امباڑے کی بھاجی کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

ہم نے سوچا تھا کہ امباڑے کی بھاجی کی فرمائش کے بعد قیام الدین کے دانت کھٹے ہو جائیں

گے۔ رات واپس ہوئے تو سچ مچ امباڑے کی بھاجی تیار تھی۔ ہم نے پوچھا ''ہمیں دہلی میں امباڑے کی بھاجی نہیں ملتی۔ آپ کو یہ جنسِ گراں مایہ لندن میں کہاں سے مل گئی؟'' نظریں نیچی کر کے بولے ''اپنے دیس سے محبت ہو تو پردیس میں بھی دیسی شئے مل جاتی ہے۔'' ہم نے ان سے مزید یہ نہیں پوچھا کہ انہیں امباڑے کی بھاجی کہاں سے مل گئی چونکہ جو شخص دیارِ غیر میں رہ کر بھی وکن میں رہتا ہو اس سے ایسا بے تکا سوال پوچھنا بیکار تھا۔ قیام الدین دوستوں کے رسیا ہیں۔ لندن میں بائیس برس تک رہنے کے باوجود انہوں نے حیدرآبادی خلوص و محبت کو جس جتن سے محفوظ رکھا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس قدر ٹوٹ کر چاہنے والے ہم نے بہت کم دیکھے ہیں۔ ہمارے دوست ضیاء الدین شکیب نے قیام الدین کے بارے میں ایک شعر بھی کہا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے۔

شکیب اپنی طبیعت جب بھی گھبراتی ہے لندن میں
تو دل کہتا ہے چل اے جاں قیام الدین کے گھر چل

• • •

برطانیہ میں دھوم ہماری
زباں کی ہے

پچھلے چار پانچ برسوں میں یہ جو ہم نے ملکوں ملکوں کی خاک چھانی ہے اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ان ملکوں کی سیر و سیاحت مقصود تھی۔ بھیّا ہم تو ان ملکوں میں اردو کو تلاش کرنے گئے تھے۔ خدا کے فضل سے جاپان جیسے کاروباری ملک میں، جہاں اردو تو اردو انگریزی تک کو کوئی نہیں پوچھتا، وہاں بھی ہم نے اردو کو ڈھونڈ ھ نکالا تھا اور اہل وطن کو یہ مژدہ سنایا تھا کہ جاپان میں اردو خیریت سے ہے اور اسے آپ کی نیک خیریت مطلوب ہے۔ جہاں تک برطانیہ کا معاملہ ہے وہاں ہم گئے ہی اردو کے چکر میں تھے۔ اردو مجلس (برطانیہ) کے مہمان تھے۔ آنے جانے کا کرایہ، کھانے، کپڑے اور پان بیڑی کے خرچ پر ان سے ہمارے دورہ برطانیہ کا معاہدہ طئے ہوا تھا اندرون ملک بھی ہم کم و بیش انہی شرائط پر اردو تنظیموں کے جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ البتہ کپڑا دینے کی شرط نہیں لگاتے۔ برطانیہ میں اس لئے لگانی پڑی کہ ہمارے ہاں ایسے کپڑے نہیں تھے جو وہاں کی سردی اور وہاں کی اردو کو موافق آسکیں۔

اردو مجلس، برطانیہ کی اہم اردو تنظیموں میں سے ایک ہے۔ اسی انجمن نے ۱۹۸۰ء میں ایک یادگار اور تاریخی آل انگلینڈ اردو کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس انجمن کے معتمد ہمارے دوست عباس زیدی ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ہمارے ہم عصر رہ چکے ہیں۔ چونکہ بے حد جذباتی آدمی ہیں اسی لئے اردو کی خدمت کے لئے نہایت موزوں شخصیت ہیں۔ اردو کے لئے ہمیشہ سر سے کفن باندھے رہتے ہیں اور اسی لئے یا تو یہ دوستوں سے ناراض رہتے ہیں یا دوست ان سے ناراض

رہتے ہیں۔ہم سے اپنی شدید محبت کے باعث لندن یونیورسٹی کے ہمارے پہلے جلسہ میں اتنے جذباتی ہوگئے اور ہمارے تعارف میں کچھ اتنا غلو کر گئے کہ ہمیں ان کے تعارف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بہت زور لگانا پڑا۔ مگر شکر خدا کا کہ لندن والے بھی عباس زیدی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔اسی لئے ہماری جان بچ گئی اور انہوں نے ہم سے اتنی ہی توقع رکھی جس کے ہم اہل تھے۔ بیرسٹر غلام یزدانی اردو مجلس کے صدر ہیں۔یہ بھی یونیورسٹی میں ہمارے ہم عصر رہ چکے ہیں۔عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کی شہرت کھلاڑی کی حیثیت سے تھی۔ہمیشہ کسی نہ کسی درون خانہ یا بیرون خانہ کھیل میں مصروف نظر آتے تھے۔اب لندن میں بیرسٹری کرتے ہیں اور لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔کسی کو جیل بھجوانا یا کسی کو پھانسی کے تختہ سے واپس بلوانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل بھی ہے بلکہ اب تو یہ کھیل ان کا پیشہ بن گیا ہے۔لندن میں کروڑپتیوں کے محلّہ سے قریب رہتے ہیں۔لکھ پتیوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔اردو مجلس تو خیر ہماری میزبان تھی ہی لیکن اس کے علاوہ ہمیں لندن میں کئی اردو تقاریب میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ہمارے زیادہ تر جلسے لندن یونیورسٹی میں ہی ہوئے جس میں شرکت کے لئے لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے آتے تھے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر یوسف علی خاں تو تین سو میل کی مسافت طئے کر کے کولچسٹر سے آتے تھے۔جس کسی سے پوچھئے معلوم ہوتا کہ کم از کم پچاس میل کی مسافت طئے کر کے آیا ہے۔

اردو کے لئے ذوق وشوق صرف لندن ہی میں دیکھا۔یہاں کی طرح نہیں کہ اردو کی کوئی محفل ہمارے گھر سے چار کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر منعقد ہو تو ہم اس میں شرکت کرنے کو ایک غیر شرعی حرکت سمجھتے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ برطانیہ میں ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ اردو بولنے والے موجود ہیں اور کم از کم پانچ سو اردو تنظیمیں ہیں۔

ہم نے کہا "دس لاکھ اردو بولنے والوں کے لئے صرف پانچ سو تنظیمیں نہایت ناکافی ہیں۔ ہمارے حساب سے دس لاکھ اردو بولنے والوں کی کم از کم بیس لاکھ اردو تنظیمیں تو ہونی چاہئیں۔

ہماری ہی مثال لیجئے کہ اول تو ہم خود اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔اس کے علاوہ ایک انجمن کے جنرل سکریٹری ہیں، دوسری انجمن میں نائب صدر کے عہدہ پر فائز ہیں۔تیسری انجمن میں ہم صدر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں، پانچویں انجمن کے ہم مشیر ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی کئی انجمنیں ہیں جو ہم سے رہنمائی ہمر پرستی اور روشنی وغیرہ حاصل کرتی رہتی ہیں۔غرض انجمن سازی اور خانہ بربادی اردو کلچر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

برطانیہ اور ہندوستان کے اردو شاعروں اور ادیبوں میں کئی مماثلتوں کے باوجود ایک واضح فرق ہمیں یہ نظر آیا کہ برطانیہ کے اردو شاعر ہمارے شاعروں کی طرح ''ہمہ وقتی شاعر'' نہیں ہیں بلکہ ہفتہ کے پانچ دن سچ مچ کام بھی کرتے ہیں۔البتہ جمعہ کو شام سے اتوار کی رات تک ''عرض کیا ہے''، اور ''ذرہ نوازی کا شکریہ'' وغیرہ میں لگے رہتے ہیں۔ہمارے ہاں خدانخواستہ کسی شاعر کا کلام اچھا ہو تو وہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے رکشا کا کرایہ بھی مانگ لیتا ہے۔برطانیہ کا اردو شاعر رکشا کا کرایہ نہیں مانگتا بلکہ اپنی موٹر میں جاتا ہے (چاہے اس کا کلام اچھا ہی کیوں نہ ہو۔) برطانیہ کے مختلف شہروں میں آئے دن آل انگلینڈ مشاعرے بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں۔برطانیہ کے اردو شاعروں اور ادیبوں کو دیکھ کر ہمیں یہ خوشی ہوئی کہ برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے اندر، حسد، رقابت، غیبت اور معاصرانہ چشمک جیسے ضروری جذبوں کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا ہے۔یوں بھی ان ضروری جذبوں کے بغیر اردو تہذیب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔چنانچہ لندن کی کسی اردو محفل سے ہم جلدی اٹھنا اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ ہمارے جاتے ہی لوگ کہیں ہماری غیبت نہ شروع کر دیں۔

برطانیہ میں یہ جو اردو کا ماحول ہمیں میسر آیا تو جی خوش ہو گیا مگر ہماری یہ خوشی پندرہ دنوں میں کافور ہو گئی۔وجہ اس کی یہ ہوئی کہ اگر لگاتار پندرہ دنوں تک ہم انگریزی نہ بولیں تو ہماری طبیعت ناساز ہو جاتی ہے۔زبان پر ورم آجاتا ہے۔ماشاءاللہ اپنے دفتر میں ہر روز اتنی انگریزی بول اور لکھ لیتے ہیں کہ انگریز بھی ہمیں دیکھے تو رشک کرنے لگ جائے۔ہم نے ابتداء میں لندن میں

اپنے احباب سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر وہ ہم سے انگریزی میں بات کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ تو انگلستان میں ہی رہتے ہیں۔ اگر ہم سے بھی انگریزی میں بات کرنا پڑے تو ہمیں برطانیہ بلانے کا کیا فائدہ۔ یہ سراسر ان کی خودغرضی تھی۔ لہٰذا پندرہ دنوں بعد ہم مسلسل اردو بولنے کی وجہ سے پریشان سے رہنے لگے۔ ایک دن لیمبتھ برج پر ایک انگریز نے ہم سے سگریٹ مانگا تو ہم نے سگریٹ دینے سے پہلے اس سے انگریزی میں اس کی خیریت پوچھنے کے علاوہ یہ بھی پوچھا کہ میاں کیا کرتے ہو، گھر میں بال بچے وغیرہ تو خیریت سے ہیں نا۔ اس نے ہمارے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ صرف سگریٹ لے کر ''تھینک یو'' کہا اور آگے کو نکل گیا۔ تب ہمیں یقین آیا کہ انگریز کسی تعارف کے بغیر کسی اجنبی سے سگریٹ تو مانگ سکتا ہے لیکن اس سے بات نہیں کر سکتا۔ ایک دن آکسفورڈ اسٹریٹ پر ایک بڑھیا نے ہم سے ایک پونڈ مانگا۔ ہم نے سوچا کہ ضرورت مند بڑھیا ہے۔ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر انگریزی میں بات کرنے کا نادر موقع ہے۔ ہم نے پوچھا ''بڑی بی کیا کرتی ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ تمہیں ایک پونڈ کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ ۱۹۴۷ء میں ہمارے ملک کو آزاد کرنے کے بعد تمہاری یہ حالت ہو جائے گی تو بخدا جد و جہد آزادی کی مخالفت کرتے۔'' مگر بڑھیا نے ہمارے اتنے سارے سوالوں کے جواب میں صرف اتنا بتایا کہ وہ فرانسیسی ہے اور انگریزی نہیں جانتی۔ خیر ہند فرانس دوستی کے نام پر اسے ایک پونڈ دیا اور آگے کو نکل گئے۔

غرض انگریزی کی شدید قلت اور بحران کے پس منظر میں ایک دن ہم بی بی سی میں اپنا انٹرویو ریکارڈ کرانے گئے تو ہمارے دوست اور بی بی سی کے پروڈیوسر مجیب صدیقی نے ہمارا تعارف بی بی سی کے ایک انگریز عہدیدار سے کرایا۔ ہم نے سوچا یہ انگریزی بولنے کا بہترین موقع ہے۔ لہٰذا ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ان پر اپنی انگریزی سے حملہ کر دیا اور لگے طرح طرح کے سوالات پوچھنے۔ ''یہ بش ہاؤس، جس میں بی بی سی کا دفتر ہے اتنا معمولی اور سیدھا سادا سا کیوں ہے؟ اگرچہ آپ کی ملکہ بھی ایک سیدھے سادے محل میں رہتی ہیں اور برطانیہ کے وزیر اعظم کا گھر بھی یونہی سا ہے لیکن بی بی سی جس کی خبریں سنے بغیر نہ تو ہمارا کھانا ہضم ہوتا ہے اور نہ ہی آپ کو کھانا ملتا

ہے، اس کا دفتر تو کم از کم کسی عالیشان عمارت میں ہونا چاہیے تھا۔ اور ہاں! یہ اچھا ہوا کہ آپ مل گئے۔ ہم تو آپ کے ملک میں انگریزی بولنے کے لئے ترس گئے تھے۔ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم۔ بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے، اور سنائیے کیا حال ہے آپ کا؟"

ہم نے سوچا تھا کہ ہماری اتنی ساری انگریزی کے جواب میں بی بی سی کے انگریز عہدیدار موصوف ضرور اپنے مخصوص لہجہ میں انگریزی بولیں گے اور اس کے جواب میں ہم پھر انگریزی بولیں گے اور یوں ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ لیکن ان انگریز عہدیدار نے اچانک نہایت فصیح اردو میں ہم سے کہا "حضور والا! آپ کھڑے کیوں ہیں، تشریف رکھئے۔ یہ باتیں تو بیٹھ کر بھی کی جا سکتی ہیں۔" یہ انگریز عہدیدار تھے مسٹر ڈیوڈ پیج جو بی بی سی کے اردو شعبہ کے انچارج ہیں۔ اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ ہم دہلی سے لندن آئے ہیں لیکن وہ ہم سے حیدرآباد کا حال پوچھتے رہے۔ (اس وقت یقین آیا کہ بی بی سی کی عام معلومات کتنی اچھی ہیں) بعض حیدرآبادیوں کے بارے میں پوچھا، جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" کی خیریت پوچھی، ہم سے روزنامہ "سیاست" کی تعداد اشاعت کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے اپنے قیاس کے مطابق تعداد اشاعت بتائی تو بولے "جی نہیں! یہ سرکیولیشن تو دو برس پہلے کی ہے۔ اب تو اس سرکیولیشن میں غالباً مزید چار پانچ ہزار کا اضافہ ہو گیا ہے۔"

ہم نے ہار مانتے ہوئے کہا "بہت دنوں سے بی بی سی کو سننے کا موقع نہیں ملا۔ اسی لئے "سیاست" کی موجودہ سرکیولیشن کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ آپ کی اطلاع یقیناً مصدقہ ہوگی۔" صاحبو! اس سانحہ کے بعد ہم نے پھر کبھی انگلستان میں انگریزی میں بات کرنے کی جرات نہیں کی۔ سارا دن اردو شاعروں اور ادیبوں کی صحبت میں بیت جاتا تھا۔ اردو مرکز اور اس کے سکریٹری افتخار عارف کا ذکر پھر کبھی تفصیل سے کریں گے۔ یہاں اتنا بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکڈلی سرکس جب بھی جاتے تھے تو اردو مرکز میں ٹھیکی ضرور لیتے تھے کیونکہ یہاں احمد فراز، شہرت بخاری، فارغ بخاری اور کئی ادیبوں کے علاوہ اردو کے کئی رسالوں اور

اخبارات سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان کے علاوہ لندن میں جن ادبی شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز، سحاب قزلباش، اکبر حیدرآبادی، یاور عباس، رضا علی عابدی، وقار لطیف، حسن عسکری، حبیب حیدرآبادی، صدیقہ شبنم، عامر موسوی، دھرم پال جی، موہن راہی، راج کھیتی، عدیل صدیقی، ایوب اولیا، باقر نقوی، معین الدین شاہ، چاند کرن صاحبہ، شمس الدین آغا، فردوس، عزیز الدین احمد، مصطفیٰ علی خاں، مریم کاظمی اور کرشن کوثر قابل ذکر ہیں۔

ان احباب کی عنایتوں اور محبتوں سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم اپنے گھر میں نہیں ہیں۔ اس لئے زیادہ خوش وخرم اور آرام سے ہیں۔

یوں تو انگلستان سے کئی اردو ہفتہ وار اور ماہنامے نکلتے ہیں لیکن لندن سے دو اردو روزنامے ''جنگ'' اور ''وطن'' بھی نکلتے ہیں۔ ہمیں اختار عارف کے ساتھ روزنامہ ''جنگ'' کے دفتر میں جانے کا موقع ملا۔ ''جنگ'' لندن کے ایڈیٹر اشرف قاضی نہ صرف تپاک سے ملے بلکہ نیوز ایڈیٹر قیصر امام، اسسٹنٹ ایڈیٹر زیڈ. خان اور چیف رپورٹر ظہور نیازی سے ہمارا تعارف بھی کرایا۔ ہم نے ان کا پریس بھی دیکھا۔ ان دنوں حلال گوشت کے مسئلے پر بریڈفورڈ میں خاصے احتجاجی مظاہرے ہو رہے تھے۔ ''جنگ'' میں ان مظاہروں کی خبروں کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔ ''جنگ'' میں چھپے ہوئے بعض اشتہارات کو دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ اردو کا اخبار چاہے لندن سے نکلے یا مالیگاؤں سے وہ اپنے مزاج اور کردار کو برقرار رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ''ملاپ'' بھی لندن سے نکلتا تھا مگر اب نہیں نکلتا۔ ساؤتھال میں ہندوستان اور پاکستان کے سارے ادبی، نیم ادبی اور غیر ادبی رسالے مل جاتے ہیں۔

ہم نے لندن میں ایک بات بطور خاص محسوس کی کہ بنگالی ادیبوں کا جلسہ ہوتا ہے تو صرف بنگالی اس میں شرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر زبان کے جلسہ میں عموماً اسی زبان کے بولنے والے شریک ہوتے ہیں لیکن جب اردو کا کوئی جلسہ ہوتا ہے تو اس میں نہ صرف بنگالی، پنجابی، سندھی اور دیگر زبانیں بولنے والے شریک ہوتے ہیں بلکہ برصغیر کے تین بڑے ممالک ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے متعلق باشندے بلالحاظ مذہب، زبان وتمدن شرکت کرتے

ہیں۔ اردو زبان کو جو کردار برصغیر میں ادا کرنا چاہئے تھا اسے غیر محسوس طور پر لندن میں ادا کر رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جو تارکان وطن اردو کی محبت کے ساتھ انگلستان میں آباد ہو گئے ہیں ان کی نئی نسل اس زبان کو کس حد تک اپنے سینہ سے لگائے رکھتی ہے۔ لندن کے بعض اردو شاعروں اور ادیبوں کی اولاد جو انگلستان میں پیدا ہوئی ہے اسے یہ نہیں معلوم کہ ''مکرر ارشاد'' کس کو کہتے ہیں؟ ''عرض کیا ہے'' کا حربہ شاعر کب استعمال کرتا ہے؟ اب وقت ہی فیصلہ کرے گا کہ انگلستان کے اردو شاعروں اور ادیبوں کی ''اولاد حقیقی'' ناخلف ہے یا ان کی ''اولاد معنوی'' ناخلف ہے۔

● ● ●

کچھ ذکرِ خیر وشر ساقی فاروقی کا

لندن میں ہماری وہ پہلی شام تھی۔ دن بھر پکاڈلی سرکس کی رونق کا حصہ بننے کے بعد، اردو مرکز میں احمد فراز اور افتخار عارف کو اور ٹرافلگر اسکوائر میں کبوتروں کو سر آنکھوں پر بٹھانے، برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے کھڑے سر ونسٹن چرچل کے مجسمے پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کو اڑانے، ویسٹ منسٹر ایبے میں کچھ دیر جھانکنے، ہاؤس آف کامنس کے پیچھے بہتے ہوئے دریائے ٹیمز میں جلتے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے پھینکنے کے بعد جب ہم گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ کئی دوستوں کے فون آئے تھے۔ تھکن اتنی زیادہ تھی کہ کسی کو فون کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں ہم نے ساقی فاروقی کو فون ملایا۔ ساقی فاروقی اپنی پاٹ دار آواز کے ساتھ فون پر سنائی دیئے تو ہم نے کہا ''السلام علیکم۔'' ''وعلیکم السلام یہ کون سلام کر رہا ہے؟''

ہم نے کہا ''بوجھو تو جانیں۔''

تھوڑے سے وقفہ کے بعد فون پر اچانک ایک ناقابل سماعت و اشاعت گالی سنائی دی۔ پھر بولے ''ارے مجتبیٰ! تم بدمعاش! کب آئے، تمہاری تو..... آنے کی صحیح صحیح اطلاع تک نہ دی۔ سالے تم تو..... کہاں ٹھہرے ہو؟''

ہم نے کہا ''ہیمپسٹیڈ میں۔''

بولے ''ارے تم تو میرے گھر سے بالکل قریب ہو۔ مگر تم جیسے لفنگے کو ہیمپسٹیڈ جیسے شریفوں کے محلّہ میں کس نے ٹھہرایا۔۔۔ تم تو۔۔۔ واقعی۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ وہ تو۔۔۔''

ہم نے کہا ''یار ساقی! فون انگریز کا ہے۔ اردو کی گالیاں اور وہ بھی تمہارے منہ سے سننے کا متحمل نہ ہو سکے گا۔''

بولے "اچھا تو یہ بات ہے۔فون پر گالیاں سننا نہیں چاہتے۔میں اور گنڈی ابھی تمہارے پاس آرہے ہیں۔گالیاں سننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔تمہاری تو....."

پچھلے آٹھ برسوں میں ساقی فاروقی جب جب دہلی آئے ہیں ان سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔دو سال پہلے وہ اپنی جرمن بیوی گنڈی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔(مسز ساقی فاروقی کا نام ہی کچھ ایسا ہے کہ ہم "گنڈی" پکارنے جاتے ہیں تو منہ سے "غنڈی" ادا ہو جاتا ہے۔) بھابھی مسز گنڈی نہایت خلیق، ملنسار اور خوش طبع خاتون ہیں۔(جرمن خواتین بہت کم ایسی ہوتی ہیں۔یوں بھی ہم دو تین جرمن خواتین کو ہی جانتے ہیں۔)

دہلی کی ایک ادبی محفل میں ساقی فاروقی کے اردو کلام پر داد کا بے پناہ شور بلند ہو رہا تھا تو ایسے میں بھابھی مسز گنڈی نے بڑی حیرت کے ساتھ ہم سے انگریزی میں کہا تھا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ ساقی اتنے بڑے شاعر ہیں۔"

اور ہم نے کہا تھا "آپ کے اردو نہ جاننے کا یہی فائدہ تو ساقی فاروقی کو پہنچ رہا ہے۔"

ہم ساقی فاروقی کی دوستی اور شاعری دونوں کے قائل ہیں چونکہ ہمارے بڑے بھائی ابراہیم جلیس مرحوم کے قریبی دوست رہے ہیں۔اسی لئے ان کی گالیاں بھی مزیدار لگتی ہیں۔ن.م.راشد کے رفیق خاص رہے ہیں بلکہ ان کی نزائی آخری رسومات کے واحد عینی شاہد بھی یہی ہیں۔ساقی کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کا کلام بلکہ مجموعہ کلام سننے میں جو لطف آتا ہے اسے بیان کرنے کی مہارت اور طہارت ہم میں کہاں؟ بقول ان کے گلے میں خضاب لگا کر کلام پڑھتے ہیں۔جب شعر پڑھتے ہیں تو شعر ان کے روم روم سے ادا ہونے لگتا ہے۔ایسے خوش طبع اور شگفتہ مزاج کہ جس محفل میں بیٹھیں لوگوں کو ہنسا ہنسا کر رُلا دیں۔کھلے دل، کھلے دماغ، کھلے ہاتھ، کھلے گریبان اور کھلے منہ (منہ کچھ زیادہ ہی کھلا ہوا ہے) کے آدمی ہیں۔ہمارے پسندیدہ شعراء کو وہ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ہمارے محبوب افسانہ نگاروں کے ذکر پر ناک بھوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ چڑھاتے ہیں بشمول قمیص کی آستینوں کے۔لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ

ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں۔

ابھی ہم ساقی کی باتیں یاد کر ہی رہے تھے کہ سیاہ پتلون اور سیاہ قمیص میں ملبوس، گلے میں سیاہ منکول کی لمبی مالا ڈالے ساقی فاروقی، گنڈی بھابھی کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں بھونچال کی طرح داخل ہوئے۔ پہلے ایک عدد گالی دی اور بے ساختہ ہم سے لپٹ گئے۔ جب ہم گنڈی بھابھی سے ہاتھ ملانے لگے تو بولے "تم ہمارے خاص دوست ہو۔ تم گنڈی کو پیار کرو گے ہاتھ نہیں ملاؤ گے۔" پھر گنڈی بھابھی سے کہا "مجتبیٰ حسین! ہمارا یار ہے تم اسے کس کرو گی۔"

جب ہم مغربی آداب کے مطابق گنڈی بھابھی کو پیار کرنے کے لئے آگے بڑھے تو گنڈی بھابھی کے جس گال پر ہم پیار کرنے والے تھے اس جانب دوڑ کر آتے ہوئے ساقی نے کہا "ذرا دیکھوں تو تم کس طرح گنڈی کو پیار کرتے ہو۔" پھر ایک فلک شگاف قہقہہ مار کر بولے "ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ سالا.....(ایک مشہور پاکستانی خفاد) آیا تھا۔ وہ بھی ہمارا خاص یار ہے۔ ہم نے اس سے گنڈی کو پیار کرنے کے لئے کہا تو ہمیں یاد ہی نہیں رہا کہ تین چار زردوں اور خطرناک بو والے قوام کا پان کھاتا ہے۔ پھر اس..... نے گنڈی کے گال پر پیار کرنے کے بجائے گنڈی کے ہونٹوں پر زردے اور قوام کا لیپ لگا دیا۔ سالے اردو کے شاعر ادیب اور خفاد کو پیار کرنا تو آتا ہی نہیں۔ ان کی تو....." ساقی نے پھر زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر بولے "تم نے مغربی آداب کہاں سے سیکھ لئے۔ تمہارے اردو ادیب ہونے میں شبہ ہو رہا ہے۔"

ساقی کی باتوں نے لندن کی ہماری اس پہلی شام کو قہقہوں سے اس طرح آراستہ کر دیا تھا کہ رات کے ایک بجنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ساقی نے ان دنوں کا ذکر چھیڑا جب لندن میں اتنے پاکستانی اور ہندوستانی آباد نہیں تھے۔ ان دنوں سادھتھال بھی ویران تھا۔ کھانے پینے کی ہندوستانی چیزیں بھی نہیں ملتی تھیں۔ مشہور شاعر سحاب قزلباش کے حوالے سے کہنے لگے "ایک دن میں سحاب قزلباش کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ ایک اسٹول پر چڑھی ہوئی ایک اونچی میز پر اپنے دونوں ہاتھ آگے اور پیچھے کو ہلا رہی ہیں۔ قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ چغتائی کے مصور دیوان غالب پر

کوکا کولا کی بوتل کی مدد سے پراٹھے بیل رہی ہیں۔ ان پر انھوں کو کھانے بعد ہی غالب کا کلام میری سمجھ میں آسکا۔ لوگ کھانے پکا کر ان کا کئی کئی دن کا اسٹاک ڈیپ فریز میں محفوظ رکھتے تھے۔ سحاب قزلباش نے پراٹھے بنانے کے بعد ڈیپ فریز کھولا اور مجھ سے پوچھا "بتاؤ کیا کھاؤ گے؟" اب جو میں نے ڈیپ فریز میں جھانکا تو دیکھا کہ اس میں انواع واقسام کے کھانے محفوظ ہیں۔ سالن اور کھانے کی ہر شے کے برتن پر اس کا نام، اس کے پکائے جانے کی تاریخ اور سن اشاعت درج تھا۔ میں کچھ دیر تک تو کھانوں، ان تاریخوں اور سنیں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر بولا "میں تو ۱۹۶۰ء کا قیمہ کھاؤں گا۔" اس کے جواب میں سحاب قزلباش نے کہا "تم نے دیر کر دی۔ ۱۹۶۰ء کا قیمہ کل ہی ایک صاحب کھا گئے۔ تم چاہو تو تمہیں ۱۹۵۸ء کے کوفتے کھلا سکتی ہوں۔"

ساقی فاروقی کی صحبت ایسی ہی باتوں اور ایسے ہی لطیفوں سے سجی سجائی رہتی ہے۔ چونکہ ہمارے دل اور لندن میں ہمارے گھر سے قریب رہتے تھے اس لئے ان سے تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی اور ہم ان کے لطیفوں کے علاوہ ان کے کلام بلاغت نظام اور بلوغت نظام دونوں سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ساقی جب اردو میں بڑی روانی اور سلاست کے ساتھ گالیاں دینے لگتے تو گندی بھابھی ہم سے پوچھا کرتی تھیں کہ ساقی اردو میں کیا کہہ رہے ہیں؟" اس پر ساقی قہقہہ لگا کر ہم سے کہتے تھے "مجتبیٰ! اردو کی گالیوں میں اتنی تجرید ہوتی ہے اور ایسی انفرادیت ہوتی ہے کہ تم تو تم اگر مولوی عبدالحق بھی ہوتے تو ان کا انگریزی ترجمہ نہ کر پاتے۔"

ساقی کے ساتھ کئی محفلیں سجیں۔ ایک دن کہنے لگے "یہ کیا تم لندن کے تاریخی مقامات کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ تمہیں ادبی لندن دکھاؤں۔ کیٹس کا گھر تمہارے گھر سے قریب ہے مگر تم اب تک وہاں نہیں گئے۔ سو ایک دن ہم ساقی فاروقی کے ساتھ ادبی لندن کو دیکھنے دو موٹروں میں نکلے۔ ساقی کی موٹر میں مغنی تبسم، حمایت اللہ اور ہم تھے۔ دوسری موٹر مشہور افسانہ نگار محسن شمسی کی تھی جن کا قہقہہ ان کی موٹر کے ہارن سے زیادہ بلند اور پرشور ہوتا ہے۔ اس میں نقی تنویر سوار ہو گئے۔ ہم سب سے پہلے کیٹس کے گھر کی طرف چلے تو ہیمپسٹیڈ ہیتھ سے

گزرے۔ ہیمپسٹیڈ کا یہ جنگل اتنا خوبصورت ہے کہ اس کے برابر سے گذرتے ہوئے ہم نے بھی اپنے اندر شاعری کو کروٹ لیتے، مچلتے اور مہکتے ہوئے محسوس کیا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پورے پونے دو سو برس پہلے انگریزی کا مشہور شاعر کیٹس رہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری چار پانچ برس اسی جنگل کے گرد و نواح میں گذارے تھے۔ بچپن میں پڑھی ہوئی کیٹس کی نظمیں ہم یاد کر ہی رہے تھے کہ ساقی نے ایک جگہ اپنی موٹر کو روکتے ہوئے کہا ''پاکستان کے مشہور اردو محقق کو ہیمپسٹیڈ ہیتھ کی سیر کرانے کے لئے میں یہاں لایا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے کہا'' یہ جو گھنے درخت آپ دیکھ رہے ہیں ان ہی میں کسی درخت سے وہ بلبل اڑا ہوگا جسے دیکھ کر کیٹس نے اپنی مشہور نظم "Ode to a nightingale" لکھی تھی۔ جانتے ہو اردو کے محقق نے کیا کہا۔ مجھ سے فوراً پوچھا ''بتاؤ کون سے درخت سے بلبل اڑا تھا۔ کون سے درخت سے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس پر میں نے اسے نہ صرف وہ درخت دکھا دیا تھا بلکہ وہ بلبل بھی دکھا دیا جسے دیکھ کر کیٹس نے اپنی شہرہ آفاق نظم لکھی تھی۔ سالے اردو کے محقق کہیں کے۔ ابھی قہقہوں کا زور نہیں تھما تھا کہ ہم کیٹس کے گھر پر موجود تھے۔ سیدھا سادہ دو منزلہ مکان ہے۔ اسی مکان میں کیٹس نے اپنی زندگی کی بہترین نظمیں لکھیں۔ اسی گھر سے متصل اسی طرح کا ایک اور گھر بھی ہے جس میں کیٹس کی محبوبہ فینی برہن رہتی تھی۔ ان کی شادی ہونے والی تھی کہ ۱۸۲۱ء میں کیٹس کا عین نوجوانی میں انتقال ہوگیا۔ کیٹس نے اسی گھر کے سامنے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر "Ode to nightingale" لکھی تھی۔ ہم نے بھی کچھ دیر اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کیٹس کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کیٹس کے بیٹھنے کے کمرہ کو جوں کا توں محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی کتابیں، اس کے خطوط قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ ہر کمرہ میں کیٹس کے کٹے ہوئے بال رکھے ہوئے ہیں۔ حمایت اللہ نے مختلف کمروں میں رکھے ہوئے کیٹس کے بالوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ یہ بال کیٹس کے نہیں ہیں کیونکہ ایک کمرہ میں رکھے ہوئے بالوں کا رنگ دوسرے کمرہ میں رکھے ہوئے بالوں سے مختلف ہے۔ ہم نے کہا ''ہوسکتا ہے بچپن میں کیٹس کے بالوں کا رنگ مختلف ہو اور نوجوانی میں ان کا رنگ بدل گیا ہو۔'' حمایت اللہ بار بار اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرتے

جاتے تھے اور کہتے تھے نہیں یہ بال کیٹس کے نہیں ہیں۔ جتنا ہم انہیں کیٹس کی شاعری کی طرف لانا چاہتے تھے اتنا ہی وہ کیٹس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوتے جاتے تھے۔

پھر ساقی ہمیں اسی علاقہ میں ویل آف ہیلتھ لے گئے۔ جہاں ۱۹۱۲ء میں رابندر ناتھ ٹیگور نے قیام کیا تھا۔ یہیں پاس میں ایک مکان بھی نظر آیا جس میں ۱۹۱۵ء میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس مقیم ہوئے تھے۔ ان مکانوں پر ان ادبی شخصیتوں کے نام اور ان کے قیام کا زمانہ لکھا ہوا ہے۔

پھر ساقی ہمیں ہیمپسٹیڈ سے قریب ہی ایک پب (Pub) میں لے گئے جس کے بارے میں بتایا کہ یہ چارلس ڈیکنس کا پسندیدہ پب (Pub) تھا۔ وہ اکثر یہاں بیٹھا کرتے تھے۔

ہم نے کہا "ساقی! ہمیں لندن آئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے۔ ہمیں آج تک کوئی ایسا پب نہیں ملا جس میں ہم بیٹھ سکیں۔ ہر پب کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس میں تو فلاں ادیب بیٹھا کرتا تھا۔ چارلس ڈیکنس نے تو پبوں میں بیٹھنے کی انتہا کر دی۔ جس کسی پب میں جاؤ، پتہ چلتا ہے کہ یہاں چارلس ڈیکنس صاحب بیٹھ چکے ہیں۔ سلون اسکوائر میں برنارڈ شا کا پب بھی دیکھا۔ سارے پب کو برنارڈ شا کی تصویروں کے ذریعے ڈراونا بنا دیا گیا ہے۔ ہم تو تھوڑی دیر بھی وہاں نہ بیٹھ سکے۔ وہاں سے اٹھ کر مارلبرو آرمس کے پب میں گئے تو پتہ چلا کہ وہاں چارلس ڈیکنس کے علاوہ ورجینا وولف اور کارل مارکس وغیرہ بھی بیٹھا کرتے تھے۔"

ساقی نے کہا "اب تم تھک گئے ہو۔ کچھ دیر چارلس ڈیکنس کے پب میں بیٹھو۔ اداس نہ ہونا۔ ہم تمہارے لئے ایک الگ پب بنا دیں گے۔"

چارلس ڈیکنس کے پب سے نکل کر ہم کین وڈ گارڈنس میں گئے۔ بڑی پر فضا جگہ ہے۔ ایک خوبصورت جھیل بھی اس باغ میں ہے جس کے کنارے گرمیوں کے موسم میں موسیقی کی بڑی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں۔ باغ کے ایک گوشہ میں ڈاکٹر جانسن (ڈکشنری والے) کا "Summer House" "گرمائی گھر" بھی موجود ہے۔ بالکل واہیات جگہ ہے۔ لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ دور سے جھونپڑی کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ قریب جا کے دیکھا تو یہ اتنا چھوٹا ہے کہ ڈاکٹر

جانسن کی ڈکشنریوں کے اگر دس بارہ نسخے اس میں رکھ دیئے جائیں تو ڈاکٹر جانسن کو اندر داخل ہونے کی جگہ نہ ملے۔ باسویل بھی ڈاکٹر جانسن سے ملنے اس ''گرمائی گھر'' میں آتا ہوگا تو باہر ہی سے بات کر کے چلا جاتا ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس زمانے میں ڈکشنری مرتب کرنے کے لئے ایسے ہی گھر میں رہنا ضروری ہوتا ہو۔ ہم ڈاکٹر جانسن کے گھر سے مایوس ہوئے تو ساقی نے کہا ''فکر نہ کرو، اب میں تمہیں لندن کے ایک مشہور شاعر کے گھر لے چلتا ہوں۔'' اور کچھ دیر بعد ہم ساقی فاروقی کے گھر میں تھے۔ ساقی کہنے لگے ''یہاں اردو کا ایک مشہور شاعر رہتا تھا ساقی فاروقی۔ کئی سو برس پہلے پاکستان سے لندن آیا تھا۔ اس نے یہیں ''پیاس کا صحرا'' لکھا۔ یہیں اس نے ''راوار'' اور ''رازوں سے بھرا بستہ'' لکھا۔ حمایت اللہ نے بات کو کاٹتے ہوئے اور اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''ہمیں پہلے ساقی فاروقی کے کٹے ہوئے بال دکھائیے جو ضرور کسی ڈبیا میں محفوظ رکھے گئے ہوں گے۔''

اور ہم نے کہا ''بالوں کو مارئیے گولی۔ ہم نے سنا ہے کہ ساقی فاروقی نے نہ صرف اپنی شاعری میں بلکہ اپنے گھر میں بھی کتے، بلیاں، کچھوے، مینڈک اور طوطے پال رکھے ہیں۔ ان کا بہت شہرہ سن رکھا ہے۔ ان کی بھی کچھ نشانیاں دکھاؤ۔''

ساقی نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا ''یار مجتبیٰ! یہ تم نے کیا یاد دلا دیا۔ میں نے جتنے پالتو جانور اور پرندے پال رکھے تھے وہ سب مرکھپ گئے۔ طوطے کو بلی نے کھالیا، کچھوے کو کتا کھا گیا۔ پھر کتا طبعی موت مر گیا۔'' پھر ایک بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ''ساری بلیاں مر گئیں۔ اب یہ ایک بلی رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔''

ڈاکٹر مغنی تبسم کو ساقی کی بلی کی تنہائی پر رحم آ گیا تو وہ سیٹی بجاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگنے لگے اور ہم نے مغنی تبسم کو سمجھایا ''مغنی صاحب! یہ انگریز بلی ہے۔ آپ اردو میں سیٹی بجائیں گے تو اس کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔''

ساقی بدستور اپنے مرحوم کچھوے کی یاد میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ بولے ''میرے ذہن میں

ایک آئیڈیا آیا ہے۔اب میں اس گھر کے آگے ایک تختی لگاؤں گا جس پر لکھا ہوگا یہی وہ گھر ہے جس میں فلاں سنہ میں ایک کچھوا رہتا تھا،نام تھا اس کا.....۔"

اور ہم نے کہا "اور انگریز سچ مچ اس مکان کو دیکھنے دور دور سے آیا کریں گے۔" اس پر ساقی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

● ● ●

کچھ حال مشتاق احمد یوسفی

سے ملاقات کا

صاحبو! ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ لندن میں ہمیں یہاں کی تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی کو بھی دیکھنا تھا۔ سو انہیں بھی دیکھ لیا۔ ہماری اور آپ ہی کی طرح کے آدمی ہیں اور کوئی خاص بات نہیں۔ ہم تو انہیں ٹرافلگار اسکوائر، برٹش میوزیم کو دیکھنے سے پہلے دیکھنا چاہتے تھے۔ ہماری اس عجلت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی تحریروں سے ہم نے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ یہ لندن کی سب سے قدیم عمارت ہیں۔ مگر جب انہیں دیکھ لیا تو احساس ہوا کہ بگ بین ان سے یقیناً پرانی ہے بلکہ ان سے دو ایک ملاقاتوں میں تو خود ہم بھی ان سے پرانے لگے۔ جو لوگ مشتاق احمد یوسفی سے ملنے کے خواہشمند ہیں انہیں ہم آگاہ کئے دیتے ہیں کہ ان کے لکھے پر بالکل نہ جائیں۔ یہ ان مزاح نگاروں میں سے ہیں جن کے قول و فعل پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ''زرگزشت''، ''خاکم بدہن'' اور ''چراغ تلے'' کو پڑھ کر ہم نے اپنے تئیں یہ سوچ رکھا تھا کہ یہ عمارت تو اب کھنڈر بن گئی ہوگی۔ سوچا تھا کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو عموماً تاریخی عمارتوں کے ساتھ کرتے چلے آئے ہیں یعنی ہاتھ لگائے بغیر دور سے دیکھ لیا۔ کچھ طرز تعمیر کی تعریف کی، کچھ بچے کھچے آثار اور نقش و نگار کو دیکھ کر اصل عمارت کی عظمت کا نقشہ ذہن میں تازہ کر لیا۔ ایک فوٹو کھینچ لیا۔ کوئی محافظ نہ دیکھ رہا ہو تو عمارت پر اپنا نام بھی کندہ کر دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ بہت ہوا تو جاتے جاتے عمارت پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے یہ مصرع جڑ دیا۔

آثار کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی

ان کی تحریروں میں ان کی انوکھی انوکھی بیماریوں کا حال پڑھ رکھا تھا بلکہ ہمیں تو یہ بھی گمان تھا کہ موصوف تصنیف وتالیف کا بیشتر کام اسپتال میں انجام دیتے ہیں۔ان کی تقلید میں ایک بار ہم بھی بڑی کوشش اور جستجو کے بعد بیمار پڑ کر اسپتال گئے تھے کہ وہاں جا کر مزاح نگاری کریں گے۔ مزاح نگاری ہم سے نہ ہوئی۔ہوتی بھی کیسے جبکہ ڈاکٹروں نے ہمیں مزاح نگاری کرنے سے منع کیا تھا۔اس لئے نہیں کہ ڈاکٹروں کو ہماری صحت کی پرواہ تھی بلکہ اس لئے کہ ڈاکٹروں کو اصل میں ہمارے قارئین کی صحت کی زیادہ فکر تھی۔ہم نے ڈاکٹروں کو بہتیرا سمجھایا کہ بھیا ہماری بیماری تو صرف ایک بہانہ ہے ورنہ ہم تو آپ کے اسپتال میں مزاح نگاری کرنے آئے ہیں۔سنا ہے جو مزاح نگاری اسپتال میں ہوتی ہے وہ کہیں اور نہیں ہوتی۔ہماری اس بات کو سن کر کچھ ڈاکٹروں نے ہمیں امراض دماغی کے اسپتال میں منتقل کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔جب ڈاکٹر ہمارے اصل مرض کو سمجھنے سے قاصر رہے تو مشتاق احمد یوسفی کی بھی مثال پیش کی کہ ہمارے حسابوں موصوف کا بیشتر ادب عالیہ اسپتال میں ہی پیدا ہوا ہے اور اندیشہ ہے کہ آگے بھی وہیں پیدا ہوتا رہے گا۔سو ہمیں بھی اسپتال میں صحت مند ادب اور غیر صحت مند بچے پیدا کرنے کی اجازت دیجئے مگر مشکل یہ پیش آئی کہ مشتاق احمد یوسفی کے بعد اردو مزاح نگاری نے تو بہت ترقی کر لی ہے لیکن علم طب نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ ڈاکٹر لوگ ہماری بات کا مطلب سمجھتے۔لہٰذا طب کے ڈاکٹروں نے ہمیں اسپتال سے اور ادب کے ڈاکٹروں نے ادب سے خارج کر دیا۔اس پس منظر کے ساتھ ہم مشتاق احمد یوسفی سے ملنے گئے تو ہم نے ان کی تحریروں کو کم اور ان کی بیماریوں کو زیادہ اپنے پیش نظر رکھا تھا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے بے لوث بہی خواہ ہونے کے ناتے دہلی سے چلتے وقت ایک طبیب حاذق سے ان کی بعض "مطبوعہ بیماریوں" کے علاج کے لئے کچھ غیر مطبوعہ نسخے بھی حاصل کئے تھے۔ان نسخوں کو ہم نے کس مشکل سے حاصل کیا تھا اس کا حال آپ کو کیا بتائیں۔ہم نے حکیم صاحب مذکور کو یوسفی کی کتابیں دے کر کہا تھا کہ ان کی کتابوں میں مندرجہ بیماریوں کا حال احوال آپ پڑھیں۔مرض کی تشخیص کریں اور کچھ نسخے، جو بقول آپ کے تیر بہدف ہوتے ہیں تجویز کریں۔ہم لندن جا رہے ہیں تو یوسفی صاحب کو دے

آئیں گے کہ اردو ادب اور مشتاق احمد یوسفی دونوں کا بھلا ہو۔اس کے بعد حکیم صاحب کے پاس ہم جب بھی مشتاق احمد یوسفی کے لئے موعودہ نسخے حاصل کرنے کے لیے گئے تو موصوف کا حال ہی جداگانہ تھا۔بات کم کرتے تھے اور ہنستے زیادہ تھے۔ایک مرتبہ کہنے لگے ''مجھے برسوں سے قبض کی شکایت تھی۔ چراغ تلے کو پڑھنے بعد یہ جاتی رہی۔''ہم نے جی ہی جی میں کہا چراغ تلے اندھیرا اسی کو کہتے ہیں۔دوسری بار گئے تو ان کی ہنسی کا والیوم کچھ زیادہ ہی بڑھا ہوا تھا۔ہم نے موعودہ نسخہ مانگا تو ٹھٹھا مار کر بولے ''ابھی تو یوسفی کی بیماریوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ ماشاء اللہ خاصی دلچسپ، شگفتہ اور صحت مند بیماریاں ہیں۔ابھی تو تشخیص کی نوبت نہیں آئی۔ تمہیں تو ابھی بہت دنوں بعد لندن جانا ہے۔اطمینان سے نسخے لے لینا اور ہاں خاکم بدہن میں نے پڑھ لی ہے۔بڑی مفرح کتاب ہے۔برسوں سے بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا وہ خاکم بدہن کے استعمال سے معتدل ہو گیا۔ہم نے کہا ''بھلے ہی اپنا نسخہ نہ دیجئے خاکم بدہن کا نسخہ تو واپس کر دیجئے۔''

بولے ''ایک مریض کو شیشے سے پہلے پڑھنے کو دیا ہے۔''

''اور چراغ تلے کا نسخہ؟''ہم نے پوچھا۔

بولے ''ایک اور مریض کو رات میں دودھ پینے کے بعد اور سونے سے پہلے پڑھنے کے لیئے دیا ہے۔''

ہم تیسری مرتبہ پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تازہ تازہ غسل سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔چہرے پر بشاشت، شرارت اور حرارت تینوں کے ملے جلے آثار نمایاں تھے۔ہم نے تاڑ لیا کہ موصوف یوسفی کی ''زرگزشت'' اور اپنی ''زن گزشت'' دونوں کو ٹھکانے لگا کر بیٹھے ہیں۔ہمیں دیکھتے ہی اپنے مطب کے ایک گوشے میں لے گئے اور رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے ''بھیا! تمہارے پاس یوسفی کی اور کتنی کتابیں ہیں۔سبحان اللہ! کیا مقوی کتابیں ہیں۔''پھر آنکھ مار کر بولے ''پہلے تو میں اپنے طور پر ان کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔اب تمہاری بھابھی کے حکم کی تعمیل میں پڑھ رہا ہوں۔بخدا کوئی ان کتابوں کو ڈھنگ سے پڑھ لے تو ''اشتہاری بیماریوں''

سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو جائے۔ میاں! لندن میں اگر یوسفی سے واقعی تمہاری ملاقات ہو تو یہ ضرور پوچھتے آنا کہ انہوں نے اپنی رائج الوقت بیماریوں کو کب، کہاں اور کیسے حاصل کیا تھا۔ میں بھی ان بیماریوں میں مبتلا ہونا چاہتا ہوں۔ بیماریوں کے ملنے کا پتہ ضرور لیتے آنا، بھولنا مت۔ میں نے کئی اور مریضوں کو بہ رضا و رغبت ان بیماریوں میں مبتلا ہونے کے لئے آمادہ کر رکھا ہے۔"

غرض مشتاق احمد یوسفی سے ملنے سے پہلے ان کے تعلق سے ہمارا ذہنی پس منظر یہ تھا۔ لندن پہنچتے ہی افتخار عارف سے کہا "بھیا! بھلے ہی ہمارے اعزاز میں اردو مرکز کا جلسہ نہ کراؤ۔ جلسوں سے ہم یوں بھی دور بھاگتے ہیں مگر مشتاق احمد یوسفی سے ہماری ملاقات تو کراؤ۔ ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں اور موقع ملے تو مزاج پرسی بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

افتخار عارف نے کہا "سو تو ہو جائے گی، فکر نہ کرو۔"

ہم نے پوچھا "ان دنوں یوسفی صاحب کہاں قیام کرتے ہیں؟ گھر پر رہتے ہیں یا حسب دستور اسپتال میں داخل ہیں؟"

افتخار عارف بولے "نہیں بھیا! اس وقت تو اپنے دفتر میں فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہو رہے ہوں گے۔ کہو تو فون پر ابھی تمہاری بات کرائے دیتے ہیں۔"

ہم نے افتخار عارف کو ٹوکتے ہوئے کہا "یار! تاریخی عمارتوں سے اس طرح فون پر بات نہیں کرتے۔ ہم خود انہیں دیکھنے چلیں گے۔ تم ان سے ملاقات کا وقت طے کر لینا۔"

ہمیں لندن آئے ہوئے چوتھا دن تھا۔ پچھلی رات ساقی فاروقی کے ساتھ گذری تھی۔ لہٰذا صبح میں جلدی بیدار ہونا قانوناً اور عملاً ممنوع تھا۔ ابھی ہم بستر ہی میں تھے کہ افتخار عارف کا فون آیا "یوسفی صاحب نے کل تمہیں اپنے گھر کھانے پر بلایا ہے۔ کل کی شام خالی رکھو۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا "کیا یوسفی صاحب بھی ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے؟"

افتخار عارف نے کہا "جان من! تم عجیب بکری ہو۔ دعوت ان کے گھر پر ہو رہی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے تو کیا تمہیں اچھوتوں کی طرح الگ بٹھا کر کھلائیں گے؟"

ہم نے کہا "نہیں یار! بات ایسی نہیں ہے۔ یوسفی صاحب غالباً پرہیزی کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے السروں کا حال ہم نے پڑھا ہے۔ خدانخواستہ ہماری وجہ سے بدپرہیزی ہو جائے اور وہ اسپتال جا کر کہیں مزاح کی ایک اور کتاب نہ لکھ ڈالیں۔"

افتخار عارف نے کہا "تمہیں شاید نہیں معلوم کہ وہ بدپرہیزی سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔"

افتخار عارف کے فون کے بعد ہم بستر سے اٹھنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو آواز آئی "میں مشتاق احمد یوسفی بول رہا ہوں۔ کیا مجتبیٰ حسین تشریف رکھتے ہیں؟"

ہم نے اچانک اپنی آواز کو بدل کر کہا "جی ہاں تشریف رکھتے ہیں۔ مگر دوسرے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں۔ ابھی بلائے دیتے ہیں۔ آپ انتظار کریں۔"

ہم نے بستر سے اٹھ کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ سر کو زور سے جھٹکا۔ گلے کو صاف کیا۔ قمیص کے بٹن ٹھیک سے لگائے اور اپنی اصلی آواز میں بولے "السلام علیکم یوسفی صاحب! ہم تو آپ کی آواز سننے کو ترس گئے تھے۔ لندن آئے ہوئے چار دن ہو گئے مگر اب تک آپ کے دیدار نہ ہو سکے۔ آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

بولے "یہ اشتیاق یک طرفہ نہیں دو طرفہ ہے۔ میں بھی آپ سے ملنے کا مشتاق ہوں۔"

ہم نے کہا "آپ تو صرف مشتاق ہیں۔ میں تو سراسر مشتاق احمد یوسفی ہوں۔"

آخر کو اپنے محبوب ادیب سے پہلی بار بات ہو رہی تھی۔ سو ہم نے ٹیلی فونی بات چیت کو بھی ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور لگے ان کی تحریروں کی تعریف کرنے۔ بولے "یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ اس وقت میں نے آپ کو یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ کل رات کا کھانا آپ ہمارے گھر کھائیں گے۔"

فون کا ریسیور رکھنے کے بعد ہمیں ۱۹۶۲ء کی سردیوں کے وہ دن یاد آ گئے جب حیدرآباد میں مشتاق احمد یوسفی کی پہلی کتاب "چراغ تلے" کا ایک نسخہ ایک حیدرآبادی خاتون کے پاس نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اس نسخے کے حصول کی خاطر ہر کوئی ان خاتون سے نہ صرف قریب بلکہ "عنقریب" ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم نے بھی موصوفہ سے قریب ہونا چاہا مگر قریب ہونے

والوں کی قطار اتنی لمبی تھی کہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ دروغ بر گردن راوی ایک مرحلہ پر موصوفہ کو یہ خوش فہمی بھی ہو گئی تھی کہ ان کے اطراف لوگوں کا یہ بھیڑ بھڑ کا ان کے حسن جہاں سوز کے سبب سے ہے۔ یہ سراسر ان کا حسن ظن نہیں حسن ظن تھا۔ ہم زندگی بھر دیکھنے والوں کی نظر دیکھنے کا کاروبار کرتے رہے۔ لہٰذا موصوفہ کو زحمت دیئے بغیر سلیمان اریب مرحوم سے کہ موصوفہ کے حلقہ بگوشوں میں تھے اور یہ کہ ''چراغ تلے'' کا نسخہ ایک دن کیلئے ان کے قبضہ قدرت میں آ گیا تھا ہم نے یہ نسخہ بالجبر حاصل کیا اور راتوں رات اپنے ناپسٹ سے اس کی تین کاپیاں ٹائپ کروا لیں۔ ہم نے مشتاق احمد یوسفی کی ''چراغ تلے'' کو اسی ٹائپ شدہ حالت میں پڑھا تھا۔ ٹائپ کی بے شمار غلطیوں کے باوجود ہمیں یہ کتاب بے حد پسند آئی تھی۔ انہی دنوں کی بات ہے ہم نے یوسفی کے تئیں اپنی عقیدت کے جوش میں یہ بھی لکھ دیا کہ ''یوسفی کو پڑھ کر آپ پطرس اور رشید احمد صدیقی کو الگ الگ پڑھنے کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔'' ادب کے کچھ ڈاکٹروں کو یہ بات ناگوار گذری تھی مگر ہم اب بھی اپنی رائے پر قائم ہیں۔ چنانچہ جب ہمارا جی رشید احمد صدیقی کو پڑھنے کو چاہتا ہے تو مشتاق احمد یوسفی کو پڑھ لیتے ہیں۔ پطرس کو پڑھنے کو جی مچلے تو مشتاق احمد یوسفی کو پڑھ لیتے ہیں۔ حد تو یہ کہ اگر کبھی مشتاق احمد یوسفی کو پڑھنے کو دل چاہے تو تب بھی مشتاق احمد یوسفی ہی کو پڑھ لیتے ہیں۔

غرض دوسری شام کو مرکزی لندن کے ایک خوبصورت فلیٹ میں ہم مشتاق احمد یوسفی سے ملے۔ ماشاء اللہ اتنے صحت مند نظر آئے کہ ان کی مزاج پرسی کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ سجا سجایا خوبصورت، وسیع اور کشادہ فلیٹ ہے۔ ''زرگزشت'' والے مشتاق احمد یوسفی جو ایڈرسن کے حضور میں جاتے ہوئے اپنی پتلون کے پیوند کو فائیل سے ڈھک لیتے تھے۔ ''چراغ تلے'' والے مشتاق احمد یوسفی جن کی عینک لگا کر بچے اندھا بھینسے کا کھیل کھیلا کرتے تھے اور خان سیف الملوک کی سائیکل کے کیریر پر بیٹھ کر جانے والے مشتاق احمد یوسفی ہمیں اس فلیٹ میں نہیں ملے۔ ''زرگزشت'' میں ان کے حالات زندگی اچھے نہیں تھے۔ اب ''حالت زندگی'' اچھی ہے۔ اصل اہمیت حالات کی نہیں حالت کی ہوتی ہے۔ بہت تپاک سے ملے۔ مرنجان مرنج، کم آمیز، کم گو اور

اپنے آپ میں سمائے ہوئے۔اس رات ان کی کم گوئی کی ایک وجہ غالباً یہ بھی رہی ہو کہ محترمہ ماہ طلعت عابدی اور افتخار عارف کی نوک جھونک کچھ اس زور وشور سے جاری تھی کہ اچھا خاصا زود گو آدمی بھی خود بخود کم گو بن جائے۔یوں بھی یوسفی اپنی کم آمیزی اور گوشہ نشینی کے لئے خاصے بدنام ہیں۔گوشہ نشینی کا یہ عالم ہے کہ رسالوں میں اپنی تصویر تک نہیں چھپواتے کہ کہیں کسی نامحرم کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔سال میں ایک بار کسی ادبی محفل میں شرکت کرتے ہیں۔ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے محفلوں میں شرکت کرنے کا اپنا یہ مجدد کوٹہ ختم کر چکے تھے۔ہم نے انہیں ہندوستان آنے کی دعوت دی۔اس سال اکتوبر یا نومبر میں ہندوستان آنے کا وعدہ ہم سے کر چکے ہیں مگر شرط وہی ہے کہ جلسہ ایک ہی ہوگا۔دوسرا جلسہ کروانا ہو تو اگلے سال پھر ہندوستان بلائیے۔ہم نے ان کی شرط مان لی ہے اور وعدہ کر لیا ہے کہ ان کا ایک جلسہ حیدرآباد میں ہوگا۔البتہ دوسرے شہروں میں صرف جلوس نکلیں گے۔ہم نے اتنا تو پڑھا ہی ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کر سکیں۔ہم نے ان سے یہ وعدہ افتخار عارف، نقی تنویر، رضا حسن عابدی اور ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب کی موجودگی میں لیا ہے۔اب آپ کو بھی گواہوں میں شامل کر لیتے ہیں۔

ہم نے یوسفی سے کہا "زرگزشت" کے بعد آپ کی کوئی تصنیف نہیں آئی۔اب تو آپ کے حالات زندگی "زرگزشت" سے آگے نکل گئے ہیں۔لہٰذا اب "زرگشت" کو بھی آگے بڑھنا چاہئے۔" بولے "میری ایک کتاب آ رہی ہے۔مگر کب آئے گی میں خود نہیں جانتا۔سنا ہے کہ کتابت ہو رہی ہے۔ایک نہ ایک دن چھپ کر آ جائے گی۔" یوسفی جس اہتمام سے لکھتے ہیں اور جس اہتمام سے اپنی کتابیں چھپواتے ہیں، یہ انہی کا حصہ ہے۔

ہم سے بولے "آپ جس طرح لکھتے ہیں اور جتنا لکھتے ہیں۔یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔"

ہم نے کہا "یوسفی صاحب! سچ پوچھئے تو ہم جس طرح لکھتے ہیں اور جتنا لکھتے ہیں، اس کے لئے ہمت کی نہیں دیدہ دلیری اور سینہ زوری کی ضرورت ہوتی ہے۔اگرچہ اب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں لکھنا بالکل نہیں آتا مگر کیا کریں اپنے ملک میں مشہور جو ہو گئے ہیں۔لوگ زبردستی لکھواتے ہیں۔"

افتخار عارف نے کہا "یوسفی صاحب! اپنے معیار کے معاملے میں اتنے سخت واقع ہوئے ہیں کہ ایک بار انہوں نے اپنا ایک مضمون ایک رسالہ کو بغرض اشاعت روانہ کیا۔ رسالہ چھپ کر آ گیا تو یوسفی صاحب کو احساس ہوا کہ مضمون ان کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔ لہٰذا بازار گئے۔ رسالہ کی ساری کاپیاں خریدیں اور انہیں خود اپنے ہاتھوں سے نذر آتش کر دیا۔"

ہم نے کہا "یار افتخار! یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ معیار کے معاملہ میں ہمارا بھی یہی حال ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جن رسالوں میں ہمارے مضامین چھپتے ہیں انہیں ہم خود نہیں جلاتے بلکہ ہمارے پڑھنے والے جلا دیتے ہیں۔ بات تو ایک ہی ہوئی۔"

معیار کی مماثلت سے ہٹ کر ایک اور معاملہ میں بھی یوسفی ہم سے مشابہ نظر آئے یعنی ہماری طرح ان میں بھی یہ اچھی عادت ہے کہ کسی کے خط کا جواب نہیں دیتے۔ سنا ہے کہ ایک محقق ان پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ وہ صاحب یوسفی سے ان کے حالات زندگی مانگتے ہیں، یہ انہیں نہیں دیتے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ان محقق صاحب نے یوسفی کو دھمکی دی ہے کہ اگر اندرون ایک ماہ وہ اپنے حالات انہیں روانہ نہ کریں گے تو وہ فلاں صاحب (جن کا نام ہم ظاہر کرنا نہیں چاہتے) کے حالات زندگی کو یوسفی سے منسوب کر دیں گے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

یوسفی سے اس رات بہت سی باتیں ہوئیں۔ ہم نے پوچھا "یوسفی صاحب! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں فوجی مزاح نگاروں کی بہتات ہے۔ ہر فوجی بندوق اٹھائے، سنگین تانے مزاح کے میدان میں گھس آتا ہے اور مورچہ سنبھال لیتا ہے۔ کرنل شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خاں، میجر صدیق سالک اور میجر ضمیر جعفری کتنے نام گنائیں۔ ہمیں تو آپ کے اور مشفق خواجہ کے سوائے کوئی سویلین مزاح نگار نظر نہیں آتا۔"

مشتاق احمد یوسفی نے ہمارے اس سوال کے جواب میں کہا "چلئے کھانا لگ گیا ہے، کہیں ٹھنڈا نہ ہو جائے۔"

اسی طرح کا ایک اور سوال پوچھا تو بولے "چلئے آئس کریم لگ گئی ہے۔ کہیں گرم نہ ہو جائے۔"

غرض ایسی ہی دلچسپ دلچسپ اور شگفتہ شگفتہ باتیں ہوتی رہیں۔

جب مغرب میں مزاح نگاری کا ذکر آیا تو بولے "جارج میکاش کا کہنا ہے کہ مغرب میں مزاح کب کا مر چکا ہے اور میں اس کی رائے سے متفق ہوں۔"

ہم نے کہا "یوسفی صاحب! سچ تو یہ ہے کہ مشرق میں بھی مزاح مر رہا ہے لیکن آپ اسے مرنے نہیں دے رہے ہیں حالانکہ ہمارے کئی مزاح نگار اسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مارنا چاہتے ہیں۔"

ہمارے اس تبصرہ پر بولے "لیجئے، چائے آ گئی ہے۔ چائے پیجئے۔"

صاحبو! تو یہ حال احوال ہے مشتاق احمد یوسفی سے ہماری ملاقات کا۔ اب آگے سن کر کیا کیجئے گا۔ باقی ملاقات بھی ایسی ہی ہوئی۔ تاہم اس ملاقات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی غرض سے اتنا اور عرض کرتے چلیں کہ جب ہم جانے لگے تو یوسفی دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ ہمارا اوورکوٹ ہینگر سے اتارا اور ہمیں پہنانے لگے۔ ہم نے نا، نا کی مگر نہ مانے۔ نتیجہ میں ہمارا ہاتھ ان کے ٹیلی فون کے ریسیور سے جو دیوار سے لٹک رہا تھا ٹکرا گیا۔ ریسیور نیچے گرا تو ہم نے معذرت کی۔ بولے "ارے نہیں! اس میں معذرت کی کیا بات ہے؟"

ہم نے جو بات یوسفی کو نہیں بتائی وہ اب آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر ان کے ٹیلی فون کے ریسیور کو گرایا تھا تاکہ وہ اس بہانے ہمیں یاد رکھ سکیں ورنہ ہمیں یاد رکھنے کی ان کے پاس کوئی معقول وجہ بھی تو نہ رہ جاتی۔ ان کے گھر سے باہر نکل آئے تو لندن کی سڑکوں پر بوندا باندی ہو رہی تھی اور ہلکی سی دھند پھیل رہی تھی۔ ہمیں نہ جانے کیوں اصغر گونڈوی کا ایک گمنام سا شعر یاد آ گیا جسے ہم نے زمانہ طالب علمی کے میں پڑھا تھا۔ آپ بھی سن لیجئے ؎

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

● ● ●

کچھ نقی تنویر کے بارے میں

تیس سال پہلے میں اور نقی تنویر چادر گھاٹ پل سے قریب موسیٰ ندی کے کنارے ایک ریستوران میں بیٹھا کرتے تھے اور تین دن پہلے میں اور نقی تنویر ویسٹ منسٹر سے قریب دریائے ٹیمز کے کنارے ایک جہازی ریستوران میں بیٹھے لندن کی جگمگاتی روشنیوں سے پرے کچھ دیکھنے، کچھ سمجھنے، کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان تیس برسوں میں ویسٹ منسٹر کے پل کے نیچے دریائے ٹیمز میں نہ جانے کتنا پانی بہہ گیا ہوگا۔ انگریزی محاورے سے کچھ زیادہ ہی بہہ گیا ہوگا اور ادھر موسیٰ ندی چونکہ انگریزی نہیں جانتی اس لئے بہتی کم ہے اور بہنے کی اداکاری زیادہ کرتی ہے۔ چادر گھاٹ کے پل کے نیچے موسیٰ ندی نہ جانے کب سے رکی کھڑی ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔

ٹھہرا ہوا دریا ہوں، بڑی دیر سے چپ ہوں

میں نے اس ٹھہرے ہوئے دریا کی سطح پر یادوں کی کنکری پھینکتے ہوئے کہا "یار نقی! کتنی عجیب بات ہے۔ تیس برس پہلے جب ہم چادر گھاٹ پل کے اس ریستوران میں بیٹھا کرتے تھے تو یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن ہم ہزاروں میل دور دریائے ٹیمز کے کنارے اپنی پیٹھوں پر تیس برس کے بیتے ہوئے وقت کی گٹھری لادے آن بیٹھیں گے تاکہ تم اپنے وقت کا حساب بتاؤ اور میں اپنے وقت کا حساب بتاؤں۔ پھر ہم دونوں مل کر دنیا کو بتائیں۔

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

اس شام نقی خاموش سا رہا کیونکہ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ میں اسے پچھلے تیس برسوں سے

جانتا ہوں۔ وہ بھی موسیٰ ندی کی طرح ٹھہرا ہوا دریا ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی جھولی میں زندگی کے تجربات مجھ سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔

میں نے کہا "یار نقی! دیکھو تو ویسٹ منسٹر کے اس پل سے لندن کس طرح جگمگا رہا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے تیس برس پہلے کی موسیٰ ندی اپنے حافظہ میں ٹیمز سے زیادہ بڑی نظر آتی ہے۔ حیدرآباد لندن سے بڑا شہر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی روشنیاں جن کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں تھا، لندن کی روشنیوں سے زیادہ روشن نظر آتی ہیں۔ حافظہ میں یہ ساری گڑبڑ نہ جانے کس طرح ہو رہی ہے۔ اصل میں نوجوانی چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ ہم اپنی نوجوانی کے پھیلے ہوئے پاٹ کو موسیٰ ندی کے پاٹ سے جوڑ دیتے تھے۔ اپنے دلوں میں جھلمل جھلمل کرنے والی روشنیوں کو موسیٰ ندی کے کنارے پر سجا دیتے تھے۔ روشنی ہمارے اندر تھی شہر میں نہیں۔ وسعت شہر میں نہیں ہمارے وجود میں تھی۔ میری اس بات پر نقی پھر بھی خاموش رہا کیونکہ پچھلے بائیس برسوں میں اس نے ٹیمز کے ساتھ گزارا کرنے کی عادت ڈال لی ہے۔ وہ دو دریاؤں کے بیچ اب ایک خاموش جزیرہ بن گیا ہے۔

مجھے اس وقت ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ ایک خاتون اپنے بچوں کو اپنے البم سے پرانی تصویریں دکھا رہی تھیں۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے ایک خوبرو اور وجیہہ و شکیل نوجوان کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "انہیں دیکھو یہ تمہارے ڈیڈی ہیں۔" اس پر سب سے چھوٹے بچے نے بڑے غور سے اس تصویر کو دیکھا اور کہا "ممی! اگر یہ ہمارے ڈیڈی ہیں تو پھر وہ گنجا اور کھوسٹ کون ہے جو ہر دم گھر میں کھانستا رہتا ہے اور جسے ہم لوگ ان دنوں ڈیڈی کہتے ہیں۔"

تو صاحبو! آج میں اسی نقی تنویر کا حال بیان کرنے چلا ہوں جو آج سے تیس برس پہلے مجھے ملا تھا۔ دھان پان تو خیر وہ آج بھی ہے مگر ان دنوں کچھ زیادہ ہی دھان پان تھا۔ جون ۱۹۵۳ء میں جب میں گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر کے عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں داخلہ حاصل کرنے کی غرض سے حیدرآباد آیا تو دو چار دنوں میں ہی نقی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھ سے ایک سال سینیر تھا اور ابتدا ہی سے حیدرآباد میں مقیم تھا۔ ان دنوں جو طلباء اضلاع سے حیدرآباد

آتے تھے ان کا سینیر طلبہ اکثر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ابتداء میں نقی مجھے بھی Rural Talent سمجھا کرتا تھا مگر بہت جلد ہم دونوں نے مل کر دو چار ایسے Rulral Talent کو تلاش کرلیا جن کے سہارے یونیورسٹی کے دن نہ جانے کس طرح بیت گئے۔ ان دنوں عثمانیہ یونیورسٹی اردو ماحول میں کمر کمر ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر دوسرا طالب علم شعر کہتا تھا اور چوتھا طالب علم افسانے لکھا کرتا تھا بلکہ انہیں دنوں عالمی امن کے موضوع پر اس کے ایک افسانے کو بین الاقوامی انعام بھی ملا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ادبی محفلوں میں ہونگ کے ذریعہ ادب سے اپنا رشتہ بنائے رکھا تھا۔

گلبرگہ کے زمانہ طالب علمی سے ہی میں آل حیدرآباد اسٹوڈینٹس یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتا تھا، جو بائیں بازو کے خیالات کے حامل طلباء کی انجمن تھی نقی سے ملا تو پتہ چلا کہ وہ نہ صرف اس انجمن کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے بلکہ بہت سی ان طالبات کی زلف ہائے گرہ گیر کا اسیر ہے جن کا میں بھی اپنے کو اسیر سمجھتا تھا۔ بعد میں ''زلفوں'' کے معاملے میں ہم نے پر امن بقائے باہم کا معاہدہ کرلیا تھا اور کبھی ہم دونوں کے درمیان اس معاملہ میں تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ آل حیدرآباد اسٹوڈینٹس یونین کی سرگرمیوں میں ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ نقی یونین کے کاموں میں بہت سنجیدگی سے حصہ لیتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر بھی اس کا آنا جانا بہت ہوتا تھا۔ ہڑتال ہو یا بھوک ہڑتال، مظاہرے ہوں یا مباحثے، نقی سب میں پیش پیش رہتا تھا۔ ہمارے ایک دوست تھے اسد۔ اب اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آل حیدرآباد اسٹوڈینٹس یونین کے جنرل سکریٹری تھے۔ ہمیشہ پیلے رنگ کا بش شرٹ پہنا کرتے تھے مشہور تھا کہ موصوف نیند میں بھی انقلابی نعرے لگاتے تھے۔ جس کسی کالج کے سامنے یہ پیلا بش شرٹ نظر آتا تھا طلباء خود بخود کلاسوں سے غائب ہو جاتے تھے کہ ''چلو پیلا بش شرٹ آگیا ہے۔ کالج کی چھٹی۔''

نقی جتنا سنجیدہ نظر آتا تھا اندر سے اتنا ہی شریر اور چلبلا تھا۔ یہ صفت تو اس میں آج بھی ہے۔ نقی اگرچہ افسانے لکھتا تھا مگر کبھی کسی کو سناتا نہیں تھا۔ میں نے تو کالج سے نکلنے کے کئی برس بعد لکھنا شروع کیا۔ لہٰذا نقی نے بڑی ہوشیاری سے کالج کے دو چار ایسے افسانہ نگاروں اور شاعروں کو ڈھونڈ

نکالا تھا جنہیں اپنی تخلیقات سنانے کا جنون تھا۔نقی ان کے جنون کی قیمت وصول کرنا خوب جانتا تھا۔

میں اس افسانہ نگار کا نام نہیں لوں گا۔اب بھی ہندوستان میں حیات ہیں اور افسانے لکھ رہے ہیں۔ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دو برسوں تک ہماری ہوٹلنگ کا سارا خرچ افسانہ نگار موصوف ہی برداشت کرتے تھے۔دیر پورہ میں ایک خاص ہوٹل تھا جہاں افسانہ نگار موصوف ہر شام افسانہ بدست آتے اور ہم دونوں فاقہ بہ شکم وہاں پہنچتے۔افسانہ سنانے سے پہلے نقی افسانہ نگار سے پوچھ لیتا تھا کہ افسانے کے انجام پر ہیروئن زندہ رہے گی یا مر جائے گی۔افسانہ نگار ہیروئن کی متوقع وفات حسرت آیات کا مژدہ سناتا تو نقی کہتا "یار تمہارے افسانے میں ہیروئن اس قدر کرب سے مرتی ہے کہ بھوکے پیٹ اس کرب کو برداشت کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ پہلے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ہم میں صبر جمیل کا مادہ پیدا کرو۔پھر ہیروئن کو شوق سے ہلاک کرنا۔ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

بیچارہ افسانہ نگار کھانے پینے کی چیزیں منگاتا۔وہ افسانہ سناتا تو ہم افسانہ کم سنتے تھے اور ہیروئن کے مرنے کا انتظار زیادہ کرتے تھے۔وہ ہر روز ایک مہلک افسانہ لے کر آتا اور ہمیں نئی زندگی عطا کر جاتا۔اس کی ہیروئن کی موت کے ساتھ ہم کچھ اور بھی زندہ ہو جاتے تھے۔یوں بھی ہمیں افسانہ سننے میں کچھ زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑتی تھی کیونکہ ہمارے افسانہ نگار دوست لفظوں کی مدد سے نہیں بلکہ ڈیشوں Dashes کی مدد سے افسانہ لکھتے تھے جیسا کہ اس زمانے میں افسانہ لکھنے کا رواج تھا۔وہ افسانہ سناتے اور نقی سنتے سنتے بیچ میں ڈیش (Dash) لگاتا تھا۔کبھی کبھی میں نقی کا ہاتھ بٹانے کے لئے افسانہ نگار موصوف کے افسانے میں ڈیش (Dash) لگانے کی کوشش کرتا تو افسانہ نگار موصوف مجھے ٹوک دیتے کہ "یار! تم ہمیشہ غلط جگہ ڈیش لگاتے ہو۔تم افسانہ سنو نقی ڈیش لگاتا رہے گا۔"

ڈیڑھ دو برس بعد افسانہ نگار نے جب محسوس کیا کہ افسانہ میں ہیروئنوں کی ہلاکت اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے تو ایک دن وہ زندہ ہیروئن کا افسانہ لے کر آ گیا۔بولا "آج میں

ایک زندہ ہیروئین کا افسانہ لے کر آیا ہوں۔"

نقی نے کہا "یار! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمیں تو اسے سیلیبریٹ Celebrate کرنا چاہئے۔ اسی بات پر منگاؤ بریانی اور ڈبل کا بیٹھا افسانہ سنانے سے پہلے۔" اور افسانہ نگار کو نقی کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

جب افسانہ نگار موصوف نے دیکھا کہ ہیروئین چاہے زندہ رہے یا مر جائے ان کی جیب پر کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا ہے تو انہوں نے ہماری اجازت کے بغیر ہیروئینوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا اور اب تک بڑے اہتمام سے ہلاک کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے بعد نقی نے "پاکٹ منی" کے طور پر ایک اور افسانہ نگار کو پھانس لیا تھا۔

افسانہ نگار اور شاعر ہم سے خائف رہنے لگے تو ہم دونوں اپنا پیشہ بدل کر معاملات حسن و عشق کے خصوصی مشیر بن گئے۔ جو کوئی بھی عشق میں مبتلا ہونا یا ہونا چاہتا تھا وہ ہم سے معاملات دل کے اسرار و رموز جاننے کے لئے آتا۔ نقی کو شاید یاد ہوگا کہ اس نے کئی دوستوں کی جانب سے ان کی محبوباؤں کے نام محبت ناموں کے مسودے تیار کئے۔ دوستوں کی محبوباؤں کے جواب آتے تو وہ ان جوابات کی روشنی میں نئے نئے محبت نامے رقم کرتا تھا۔ ان میں سے کئی محبتیں کامیاب بھی ہوئیں اور اب خیر سے صاحب اولاد بھی ہیں۔ اس سلسلے میں میں اپنے مشترک دوست رام چندر راؤ کلکرنی کی مثال دینا چاہوں گا کہ موصوف ایسے نکمے واقع ہوئے تھے کہ محبت کرنے کے لئے کسی مناسب لڑکی کا انتخاب تک نہ کر سکتے تھے۔ ہم لوگ ہر روز ٹرین سے یونیورسٹی جایا کرتے تھے۔ ایک دن کلکرنی نے کہا "یار! تم لوگ الگ الگ محبت کرتے ہو۔ میرا کوئی خیال نہیں کرتے۔ آخر میں بھی تو محبت کرنا چاہتا ہوں"۔ نقی نے کہا "تم پہلے کسی لڑکی کا انتخاب کرو پھر ہم تمھاری محبت کے لئے زور لگاتے ہیں۔" بولا "یہی تو نہیں کر سکتا۔ یہ کام بھی تم دونوں کو کرنا ہوگا۔ آخر دوست کس کام آئیں گے۔" دو دن بعد میں نے اور نقی نے اس کے لئے ایک لڑکی کا انتخاب کیا جو اسی ٹرین سے سکندرآباد جایا کرتی تھی۔ کلکرنی نے لڑکی کو دیکھا تو بولا "یہ تو بہت خوبصورت ہے۔ مجھ سے کیونکر محبت کرے گی۔؟" ہم نے کہا "تم ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہو،

انشاء اللہ کو ہر مقصود مل جائے گا۔"

اس کے بعد ہر شام کلکرنی کو محبت کا درس دیا جانے لگا جسے وہ دوسرے دن صبح تک بھول جاتا تھا۔ وہ ہم سے سیکھ کر تو بہت کچھ جاتا تھا مگر اس بت ناز کے سامنے پہنچتا تو حرف مدعا اس کی زبان پر نہ آتا تھا۔ جب وہ ہماری تربیت پر عمل کرنے سے قاصر رہنے لگا تو نقی نے ایک دن اسے دھمکی دی کہ "اگر تم اس لڑکی کے سامنے اظہار محبت نہیں کر سکتے تو پھر اس لڑکی سے دست بردار ہو جاؤ تا کہ ہم اس سے محبت کریں۔ بلاوجہ ایک خوبصورت لڑکی کو ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔" کلکرنی پر اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ طے پایا کہ کلکرنی کی طرف سے محبت نامہ اس لڑکی کے نام تیار کیا جائے جسے وہ دوسرے دن اس لڑکی کو تھما دے گا۔ نقی نے محبت نامہ کا ایک زوردار مسودہ تیار کیا جس میں کلکرنی نے اپنی بزدلی کے مطابق کچھ ترمیم کرنی چاہی مگر نقی راضی نہ ہوا۔ کلکرنی سے کہا گیا کہ وہ اس مسودہ کو فیر یعنی صاف کر کے لے آئے۔ مسودہ فیر ہو کر آیا تو دیکھا کہ اس میں جا بجا املا کی غلطیاں ہیں۔ نقی نے اسے ڈانٹا کہ تم محبت نامہ کو صحیح طور پر نقل تک نہیں کر سکتے۔ محبت کیا خاک کرو گے۔ بالآخر نقی کی ہینڈ رائٹنگ میں محبت نامہ تیار ہوا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ کلکرنی اس محبت نامہ کو اس لڑکی کے حوالہ کرنے کے بعد چلتی ٹرین سے کود گیا تھا۔ لڑکی کو یا تو کلکرنی بھا گیا یا اس کی یہ ادا بھا گئی کہ یہ سلسلہ یہاں سے جو آگے بڑھا تو وہ ڈرپوک اور بزدل کلکرنی جس کی زبان اظہار محبت کرتے ہوئے لڑکھڑا جاتی تھی ایک دن اتنا نڈر بن گیا کہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ بھگا لے گیا۔ کلکرنی برہمن تھا اور وہ لڑکی اچھوت تھی۔ کلکرنی اور اس لڑکی کے ارکان خاندان ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ بتاؤ یہ دونوں کہاں ہیں؟ ہم دونوں کو پتہ تھا کہ کلکرنی کہاں ہے مگر نہ تو نقی نے اتا پتہ بتایا اور نہ ہی میں نے۔ بعد میں کلکرنی نے جس کی بزدلی کا دور دور تک شہرہ تھا اپنی بیوی کے لئے سماج سے وہ جنگ کی کہ ہم سب دیکھتے رہ گئے۔ اگر نقی نے مذاق مذاق میں اسے نڈر نہ بنایا ہوتا تو وہ آج اتنی خوش حال زندگی کیوں کر گزارتا۔ کلکرنی اور مسز کلکرنی اب بھی کبھی ملتے ہیں تو نقی کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نقی کے تحریر کردہ محبت ناموں نے کئی زندگیاں سنواردیں مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ نقی کے بعض محبت نامے خود اس کے کام نہ آ سکے۔

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

کالج سے نکلنے کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے راستوں پر چل پڑے مگر حیدرآباد کا ''اورینٹ ہوٹل'' وہ جگہ تھی جہاں ہم لوگ ہر شام ملا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کا صحیح ادراک ہمیں اسی ہوٹل میں حاصل ہوا اور یہیں ہم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ہوٹل کیا تھا ایک ایسا گھاٹ تھا جس پر ادیب، شاعر، مصور، سیاست داں، فلسفی سب ایک ساتھ چائے پیتے تھے۔ دنیا کے بہترین ادب سے ہم یہیں روشناس ہوئے اور زندگی کے تعلق سے ایک سنجیدہ اور معتبر رویہ اپنایا۔ ڈاکٹر یوسف اور وقار لطیف سے یہیں ملاقات ہوئی۔ نقی نے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور میں صحافی کی حیثیت سے حیدرآباد کے روزنامہ ''سیاست'' سے وابستہ ہو گیا تھا۔

ان دنوں ہم لوگوں کے مزاج میں ایک عجیب سا اضمحلال پیدا ہو گیا تھا جو زندگی کے تضادات کے ادراک سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم لوگوں کی بنیادی شوخی و شرارت برقرار تھی۔ نقی کی ایک خوبی مجھے ہمیشہ سے پسند رہی کہ جاگیردارانہ گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اس نے زندگی کے لئے ہمیشہ ایک صحت مند اور ترقی پسندانہ رویہ اپنایا۔ کالج سے نکلنے کے بعد نقی نے چھ برس حیدرآباد میں ہی گزارے۔ اس کی افسانہ نگاری کا شوق بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔

پھر ۱۹۶۱ء میں ایک دن نقی انگلستان کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے خطوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ وہاں کن مشکلات سے دوچار ہے۔ ہر خط میں اورینٹ ہوٹل کا حال یوں پوچھتا تھا جیسے یہ اس کا رشتہ دار ہو۔ ۱۹۶۹ء میں جب یہ ہوٹل ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تو اس نے مجھے ایک درد بھرا پُرسے کا خط لکھا۔

۱۹۶۱ء کے بعد نقی سے بس چند ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ پچھلے سال وہ بین الاقوامی فلمی میلہ میں شرکت کے لئے دہلی آیا تھا۔ دس بارہ دن خوب ملاقاتیں رہیں۔ نقی نے برطانیہ آ کر انگریزی صحافت میں جو مقام حاصل کیا ہے اسے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ دہلی کی تفصیلی ملاقاتوں میں میں نے اندازہ لگایا کہ آج سے پچیس تیس برس پہلے ہم دونوں نے زندگی کو دیکھنے، پرکھنے اور برتنے

کے لئے جو زاویہ نگاہ اپنایا تھا وہ اب بھی ہم دونوں کے پاس محفوظ ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لندن جیسے شہر میں اتنے برس گزارنے کے باوجود اس کا زاویہ نگاہ گرد آلود نہیں ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی گزارنے کے لئے زندگی کی نہیں بلکہ ایک زاویہ نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی زاویہ نگاہ سے میں موسیٰ ندی کو دیکھتا ہوں اور اسی زاویہ نگاہ سے نقی ٹیمز کو دیکھتا ہے اور اب تو میں نے ٹیمز کو بھی دیکھ لیا ہے۔ ۱۹۶۱ء سے پہلے لندن میرے لئے دیگر شہروں کی طرح ایک شہر تھا۔ مگر جب سے نقی اس شہر میں آباد ہوا ہے میں لندن کی ہر تبدیلی کا نقی کے پس منظر میں جائزہ لیتا ہوں۔ مارگریٹ تھیچر پھر سے برسرِ اقتدار آتی ہیں تو یہ سوچتا ہوں کہ اس سے نقی کا بھلا ہوگا یا نہیں۔ شہر عمارتوں سے نہیں بنتا، اس شخص سے بنتا ہے جو اس میں آباد ہوتا ہے۔ پھر اس شہر میں میرا سب سے پیارا دوست رہتا ہے۔ اس کے حوالے سے اب ٹیمز بھی اپنی لگتی ہے۔ ٹرافلگار اسکوائر بھی اپنا لگتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بکنگھم پیلیس بھی اپنا ہی لگتا ہے۔ یہی میرا زاویہ نگاہ ہے اور یہی زاویہ نگاہ نقی کا بھی ہے۔

• • •

پیرس میں مسرور خورشید نے ہمیں مسرور کیا

آدمی یوروپ جائے اور پیرس کو نہ دیکھے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آگرہ جا کر وہاں کا پیٹھا تو کھا آئے لیکن تاج محل کو نہ دیکھے۔ ہم بھی بہت دنوں تک برطانیہ میں پیٹھا ہی کھاتے رہے۔ شہروں کا شہر پیرس یوروپ کے کلچر کا مرکز ہے۔ اور ہم کلچر کے پاس ذرا دیر سے ہی جاتے ہیں۔ ۱۱ر مارچ کی وہ ایک خنک شام تھی جب ہم لندن کے احباب کو خدا حافظ کہہ، اپنے کندھے پر جھولا ڈال وکٹوریہ اسٹیشن کے سامنے بس میں سوار ہو گئے۔ رات کو بسوں کا یہ قافلہ لندن سے چلتا ہے اور دوسرے دن منہہ اندھیرے پیرس پہنچ جاتا ہے۔ آنے جانے کا کرایہ صرف ۲۸ر پونڈ ہوتا ہے۔ بس میں سوار ہوتے ہی ہمیں احساس ہو گیا کہ ہم اچانک ایک غیر مانوس دنیا میں پہنچ گئے ہیں کیونکہ بس میں کوئی انگریزی بولنے والا دکھائی دیتا تو دور کی بات ہے سنائی تک نہ دیتا تھا۔ اکثریت فرانسیسیوں کی تھی جو "غوغاں" کر رہے تھے۔ فرانسیسی اپنی بات چیت میں "غ" کا جتنا استعمال کرتے ہیں اتنا یوروپ میں شاید ہی کوئی اور قوم کرتی ہو۔ تبھی تو کلچر کے معاملہ میں انہوں نے اتنی ترقی کی ہے۔ بس بڑی دیر تک لندن میں گھومتی رہی۔ پھر شہر سے باہر نکل گئی۔ تین گھنٹوں کے سفر کے بعد ہمیں یہ مژدہ سنایا گیا کہ ہم برطانیہ کی بندرہ گاہ ڈوور پہنچ گئے ہیں۔ یہاں سے بس اب سمندری جہاز میں داخل ہوگی اور بعد میں یہ سمندری جہاز ہمیں بس سمیت فرانس کی بندرگاہ بولون تک لیجائے گا۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم کسٹم وغیرہ کی رسومات طے کر لیں۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ ڈوور کی بندرگاہ کو تو خیر ہم کیا دیکھتے لیکن اس کے اطراف پھیلی ہوئی سفید رنگ کی

پہاڑیوں کو دیکھ کر ہمارے وجود میں اجالا سا پھیل گیا۔ سبحان اللہ کیا اجلی اور شفاف پہاڑیاں ہیں۔ یوں لگا جیسے کسی نے سارے ماحول میں روئی کے گالے اچھال دیئے ہوں۔ اس منظر کو دیکھ کر ہماری روشنی طبع کچھ اور تیز ہوگئی۔ اور ہمیں ہر طرف سپیدی کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بادل نخواستہ اس منظر کو چھوڑ کر ہم دوبارہ بس میں سوار ہو کر سمندری جہاز میں داخل ہونے لگے تو دیکھا کہ بسوں کی ایک لمبی قطار ہے جو سمندری جہاز میں داخل ہوتی چلی جارہی ہے۔ جہاز کی نچلی منزل میں بس رکی تو ہمیں بتایا گیا کہ ہم فرانس کی بندرگاہ بولون کے آنے تک آزاد ہیں۔ جہاز میں جہاں چاہیں بیٹھیں مگر بولون کے آتے ہی بس میں آن بیٹھیں۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ فرانس اور انگلستان کے بیچ سمندر میں اکثر تموج رہتا ہے۔ ہم جہاز کے ریستوران میں بیٹھے سمندر کے اشتعال کو کافی پی پی کر قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک امریکی لڑکی جو بس میں ہماری ہمسفر تھی ہمارے پاس آئی اور ہم سے سگریٹ مانگنے لگی۔ ہم نے اس کی خدمت میں سگریٹ پیش کیا تو ہماری قومیت، ہماری تعلیم، ہمارے پیشے وغیرہ کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرنے لگی۔ اس کی معلومات میں خاصہ اضافہ کرنے کے بعد ہم نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا تو اعلان ہوا کہ بولون کی بندرگاہ آگئی ہے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار ہمیں رودبار انگلستان کے مختصر ہونے کا دکھ ہوا۔ وہ بولی کوئی بات نہیں، بس میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں آپ کی معلومات میں اضافہ کروں گی۔ ہم پھر کسٹم رسومات سے گذر کر بس میں آن بیٹھے۔ امریکی لڑکی نے پھر ہم سے سگریٹ مانگا اور لگی ہماری معلومات میں اضافہ کرنے۔ پتہ چلا یوروپ کی سیر کو نکلی ہے۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اللہ نے سب کچھ دیا (سگریٹ کے سوائے)۔ ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ اس لئے کہ ابھی دنیا نہیں دیکھی۔ یوں بھی دنیا کو دیکھے بغیر شادی کرنے کا کیا فائدہ۔ ہماری طرح نہیں کہ شادی ہوئے پچیس برس بیت گئے ہیں اور اب دنیا دیکھنے کو نکلے ہیں اور وہ بھی بیوی کے بغیر۔ یوں بھی مخدومی مشتاق احمد یوسفی نے کہیں لکھا ہے کہ پیرس کی سیر پر جاتے ہوئے اپنے ساتھ بیوی کو لاد کے لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی ہمالیہ پہاڑ پر جانے لگے اور اپنے ساتھ احتیاطاً تھرماس میں برف کی ایک ڈلی بھی رکھ لے۔ خیر پیرس کی

سرزمین پر ہماری بس نے قدم رنجہ فرمایا تو صبح کی اولین ساعتیں آچکی تھیں۔فرانسیسی دیہاتوں کے اجلے،سفید اور چمکیلے مکانوں نے ہماری آنکھوں کو منور کر دیا۔برطانوی مکان زیادہ تر سرخ اینٹوں کے بنے ہوتے ہیں اور ان کا رنگ بھورا یا زردی مائل سا ہوتا ہے جبکہ فرانسیسی مکان سفید اور بھڑکیلے ہوتے ہیں۔فرانس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں اس بات سے سخت تشویش ہوئی کہ ہماری بس نے اچانک ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی شروع کر دی یعنی جو بس اب تک سڑک کے بائیں طرف چل رہی تھی اس نے اچانک دائیں طرف کو چلنا شروع کر دیا۔سارا یورپ دائیں طرف کو چلتا ہے مگر برطانیہ اپنے روایتی مزاج کی وجہ سے بائیں طرف کو چلتا ہے۔ کچھ دیر تک عجیب سی الجھن ہوتی رہی۔پھر اپنی بیوقوفی پر غصہ بھی آیا کہ چار دن کے لئے فرانس میں آئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ فرانسیسیوں کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری ہماری ہے۔

بس جوں جوں پیرس کے مضافات سے گذرنے لگی ہمیں مسرور خورشید کا خیال آنے لگا۔ان سے پچھلی شام فون پر یہ بات طئے ہوگئی تھی کہ وہ پیرس کے محلہ اسٹالن گراڈ کے بس اسٹاپ پر ہمارا انتظار کریں گے۔پہلے تو ہمیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ جب روس میں اسٹالن گراڈ باقی نہیں رہا تو پیرس میں کہاں سے آئے گا مگر لوگوں نے یقین دلایا کہ پیرس میں دوسری جنگ عظیم کی یادگار کے طور پر ایک عدد اسٹالن گراڈ موجود ہے۔اسٹالن گراڈ کا مسئلہ تو خیر حل ہوگیا تھا لیکن مسرور خورشید کا مسئلہ ہم سے طئے نہ ہوتا تھا کیونکہ مسرور خورشید سے ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔دوستوں سے ان کا ذکر بہت سنا تھا۔ان کی قلندری اور ان کے مزاج کے مدوجزر کی داستانیں بھی سنی تھیں۔لندن میں کئی برس گزارنے کے بعد پچھلے سات آٹھ برسوں سے وہ پیرس میں مقیم ہیں اور تنہا رہتے ہیں۔ہر شریف آدمی کی طرح ماضی بعید میں ان کا تعلق حیدرآباد سے رہ چکا ہے اور علامہ رشید ترابی مرحوم کے قریبی عزیز ہیں۔ہم نے مسرور خورشید کو اسٹالن گراڈ کے بس اڈے پر پہچاننے کی خاطر اپنے ایک دوست سے مسرور خورشید کے حلیہ کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا پاکستان کے سابق صدر جنرل یحیٰی خاں کے ہم شکل ہیں۔بڑی مشکل سے اپنے شخصی حافظہ میں

جنرل یحییٰ خان کے نقوش کو از سر نو تازہ کرنے کی کوشش کی تو برصغیر کی تاریخ نے ان کا جو چہرہ بنایا تھا اس کے خد وخال ذہن میں ابھرنے لگے۔ بارے اسٹالن گراڈ کے بس اڈے پر اتر کر اب جو ہم نے جنرل یحییٰ خاں کو تلاش کرنا شروع کیا تو جنرل صاحب تو کہیں نظر نہ آئے البتہ ہندوستانی فلموں کے مزاحیہ اداکار دھول کے ہم شکل ایک صاحب دور سے تیز تیز آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ سرور خورشید تھے۔ پستہ قد، پھرتیلے اور گٹھیلے بدن کے۔ پیرس کی اس سرد اور کپکپاتی صبح میں وہ کچھ ایسی گرم جوشی سے ملے کہ ہماری ساری تھکن دور ہوگئی۔

ہماری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ سو ہم عادتاً ان سے کچھ رسمی گفتگو بھی کرنا چاہتے تھے مگر وہ ہماری رسمی گفتگو کو سننے کے مشتاق نظر نہیں آئے۔ انہوں نے فون پر ہم سے کہہ دیا تھا کہ ہم اپنے ساتھ اپنا ایک عدد فوٹو بھی لے آئیں۔ انہوں نے پوچھا ''آپ کا فوٹو کہاں ہے؟'' ہم نے فوٹو ان کے ہاتھ میں تھمایا تو اسے لے کر تیز تیز قدموں سے زیر زمین اترنے لگے۔ یہ اسٹالن گراڈ کا زمین دوز ریلوے اسٹیشن تھا۔ پیرس کی زمین دوز ریل کو 'میترو' کہا جاتا ہے۔ لندن کی ''ٹیوب'' اور پیرس کی 'میترو' میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فرانس کی ریلیں یوروپ کی ریلوں میں سب سے کارکرد اور کامیاب سمجھی جاتی ہیں۔ رفتار جتنی تیز کرایہ اتنا ہی کم ہے۔ سرور خورشید نے دو چار منٹ میں میترو میں ہمارے ایک ہفتہ کے سفر کا پاس بنوا دیا۔ ہمیں لے کر چھپاک سے ایک ٹرین میں گھس گئے۔ پھر بولے 'حضرت! آپ سے مشکل یہ ہے کہ آپ نے پیرس کی سیر کے لئے صرف چار دن نکالے ہیں۔ چار دن بہت چھوٹے ہیں اور پیرس لندن سے چھوٹا شہر ہونے کے باوجود لندن سے بہت بڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کم سے کم وقت میں زیادہ پیرس دیکھیں۔ میں نے چار دن کی چھٹی لے لی ہے اور پورے ایک ہفتہ کا کھانا بنوا لیا ہے۔ اب فوراً گھر چلتے ہیں۔ سامان رکھ کر فوراً بھاگتے ہیں۔''

انہوں نے ہمیں جواب میں بولنے کا موقع نہیں دیا کیونکہ اتنی دیر میں وہ اسٹیشن آ گیا جہاں سرور خورشید کا گھر تھا۔ ان کا گھر جس علاقے میں ہے اسے RUE MUFFTARD کہتے ہیں۔

بولنے میں اس کا تلفظ "روم افتاد" ادا ہوتا ہے۔ ہم نے تاڑ لیا کہ کوئی افتاد پڑنے والی ہے۔ پتہ چلا اس علاقہ میں فرانس کے کئی نامور مصور اور ادیب رہ چکے ہیں۔

ان کا گھر ایک کمرہ پر مشتمل ہے جو دنیا بھر کی کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ (اردو کی کتابیں زیادہ ہیں)۔ مسرور خورشید کے بارے میں وقار لطیف کا جملہ یاد آیا کہ کتابیں مسرور خورشید کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ اس کمرے میں کتابوں کے سما جانے کے بعد خود مسرور خورشید کے رہنے کے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار متواتر چار دنوں تک ہمیں بھی کتابوں سے نہ صرف قریب بلکہ خود کتابوں کے اوپر رہنے کا موقع ملا کیونکہ ہمارے لئے جو پلنگ انہوں نے مختص کر رکھا تھا اس کے نیچے پلنگ کی سطح تک کتابیں لبالب بھری ہوئی تھیں بلکہ بعض معرکتہ الآرا کتابیں تو سطح سے اوپر تک جھانکنے لگی تھیں۔ چنانچہ پہلی رات ہمیں پلنگ پر چین کی نیند نہیں آئی تو انہوں نے دوسرے دن ازراہ عنایت ہمارے پلنگ کے نیچے سے دانتے، نطشے، کوئیلھو، برنارڈ شاہ اور سارتر کی کتابیں نکال کر فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے شعری مجموعے اور کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے مجموعے رکھ دیئے تھے۔ دوسری رات ہمیں سچ مچ گہری اور پرسکون نیند آئی۔ اردو سے ہمیں کتنی محبت ہے اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔

مسرور خورشید عجلت اور جلد بازی کا نمونہ ہیں۔ ہر دم بے چین، مستعد اور پھرتیلے۔ گھر پہنچ کر وہ کچھ بتائے بغیر غائب ہو گئے۔ ہم نے موقع کو غنیمت جان کر کمر سیدھی کرنی چاہی تو کیا دیکھتے ہیں کہ مسرور خورشید اپنے دونوں ہاتھوں میں دو لمبی لمبی چھڑیاں لئے چلے آ رہے ہیں۔

ہم نے کہا "یہ آپ نے اچھا کیا کہ پیرس کی سیر کے لئے دو واکنگ اسٹکس Walking Sticks خرید لیں۔ ایک آپ کے کام آئے گی اور ایک کو میں استعمال کروں گا۔"

بولے "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ چھڑیاں نہیں روٹیاں ہیں۔"

ہم نے حیرت سے ان قد آدم روٹیوں کو دیکھا۔ افسوس کہ نظیر اکبر آبادی کی نظر ان روٹیوں پر نہیں پڑی ورنہ انہیں چاند اور سورج روٹیوں کی طرح دکھائی نہیں دیتے بلکہ مینار پر روٹی کا گمان

ہوتا۔ ہمارے ملک میں ایسی روٹیوں کا رواج بہت کارآمد ہوسکتا ہے۔ بالخصوص ضدی بچوں کو روٹی کھلانا آسان ہوجائے گا۔ شرافت سے روٹی کھائیں تو ٹھیک ہے ورنہ اسی روٹی سے ضدی بچوں کی پٹائی شروع کردی۔ مسرور خورشید نے ہمیں پلنگ پر آرام کرتے دیکھا تو بولے "حضرت! یہ آپ اپنی کمر وغیرہ لندن جا کر سیدھی کیجئے۔ پیرس میں آپ کو لگاتار گھومنا ہے۔ پانچ منٹ میں کھانا کھا کر چلتے ہیں۔ پہلے ہم لووف کے شہرہ آفاق میوزیم کی سیر کریں گے۔ سہ پہر انگل نا ور کے سائے میں گذرے گی۔ شاہراہ شانز الیزے شام میں آپ کا انتظار کرے گی۔ محراب فتح کے دیدار بھی وہیں ہوجائیں گے۔ اور دریائے سین تو آپ کو کئی جگہ مل جائے گا۔ ویسے آپ کی ساری شامیں بک ہوچکی ہیں۔ میں نے پیرس کی بعض اہم شخصیتوں سے کہہ رکھا ہے کہ آپ آرہے ہیں۔ یہ شخصیتیں آپ سے ملنے کے لئے میرے گھر آئیں گی۔ آج کی شام سوبورن یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو جناب عبدالماجد آپ سے ملنے کے لئے آرہے ہیں۔ ہمیں سات بجے گھر پہنچنا ہوگا۔ کل دن میں پیرس کی مشہور کتب فروش کمپنی "شیکسپیر اینڈ کمپنی" کے مالک اور دانشور مسٹر جارج سے ملنا ہے۔ شام میں عالمی شہرت یافتہ مصور حیدر رضا آپ سے ملنے آرہے ہیں۔ پرسوں ایک فرانسیسی دانشور کرستیان لادو اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے پاس آپ کو چلنا ہے۔"

ہم نے کہا "خاں صاحب! مسٹر جارج اور کرستیان لادو کے بارے میں تو ہم نہیں جانتے۔ البتہ حیدر رضا اور ڈاکٹر حمید اللہ کے بارے میں خوب جانتے ہیں۔ ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اتنی بڑی شخصیتوں سے ملیں۔ حیدر رضا ایک بار دہلی آئے تھے۔ دہلی کے رابندر بھون میں انہیں دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت ہماری ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ان سے ملیں۔ جس فنکار سے ہم دہلی میں نہیں ملے اس سے اب پیرس میں ملاقات کیسے ہوسکتی ہے۔ پھر آپ نے اتنے بڑے فنکار کو اپنے ہاں کیوں بلایا۔ اخلاق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم خود جا کر ان سے ملیں۔"

مسرور خورشید بولے "حضرت! یہ سب کاریگری ہے۔ میں نے حیدر رضا کو بتایا ہے کہ آپ اردو کے پائے کے ادیب ہیں۔ اس پر حیدر رضا نے کہا کہ وہ خود آپ سے ملنے کے لئے آئیں

گے۔ چنانچہ کل شام وہ آرہے ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر میں سچ مچ اس قابل نہیں ہوں کہ حیدر رضا جیسے بڑے آرٹسٹ سے ملوں۔"

بولے "مگر میں نے تو آپ کو اس قابل بنا دیا ہے۔ چلئے اب اس مسئلے پر بات نہیں ہوگی۔ اب اٹھئے بہت دیر ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر مسرور خورشید ہمیں تقریباً گھسیٹتے ہوئے گھر کے باہر لے گئے۔ مسرور خورشید نے پیرس کی سیر اس طرح کرائی جیسے قصائی بکرے کو ذبح کرنے کے لئے لے جاتا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم لووف Louvre کے شہرہ آفاق میوزیم میں تھے۔ لووف کا میوزیم جس محل میں واقع ہے وہ چالیس ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اتنا بڑا میوزیم ہے کہ اسے دیکھنے کے لئے ایک عمر چاہئے۔ یونان، روم، مصر اور مشرقی ممالک کے شعبے الگ ہیں۔ دنیا بھر کے مجسمے اور مصوری کے شاہکار ہیں۔ جتنے قیمتی مجسمے اور پینٹنگس اس میوزیم میں ہیں دنیا کے کسی اور میوزیم میں نہیں ہیں۔ دوسری صدی قبل مسیح کے مشہور و معروف وینس ڈی میلو کے مجسمے کا دیدار بھی یہیں ہوا۔ لیونارڈ ڈاونچی کی شہرہ آفاق پینٹنگ "مونالیزا" کو بھی اسی میوزیم میں دیکھا۔ اس تصویر کی یوں حفاظت کی جاتی ہے جیسے کوئی زندہ ہستی ہو۔ بلٹ پروف شیشے کے پیچھے سے مونالیزا ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور ہم اس بات پر مسکراتے رہے کہ بلٹ پروف شیشے کی حفاظت میں رہنے کے باوجود ایک سپاہی بندوق تانے مونالیزا کی مسکراہٹ کی حفاظت کر رہا ہے۔

فرانسیسیوں کی انگریزی یا تو یونہی کمزور ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر اپنی انگریزی کو کمزور بناتے چلے جاتے ہیں۔ اس میوزیم میں ہمیں ایک جگہ انگریزی عبارت نظر آئی جس میں لکھا تھا CLOACK ROOM FRUTHER DOWN NOT HERE. ۔اس انگریزی عبارت کا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ اس منزل سے نیچے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں اور اگر آپ کو پیشاب وغیرہ آرہا ہے تو یہیں سے فارغ ہو کر جائیے کیونکہ نیچے کوئی پیشاب خانہ وغیرہ نہیں ہے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ کسی فرانسیسی کو انگریزی آتی بھی ہو تو وہ انگریزی نہیں بولتا اور اگر بولتا ہے تو انگریزی کا کچومر نکال دیتا ہے۔ فرانسیسیوں کے قول و فعل کا بھی کوئی بھروسہ نہیں کیونکہ یہ لکھتے کچھ

ہیں اور پڑھتے کچھ اور ہیں، "PALAIS DE CHAILLOT." کو 'پیلے دی شیو' بولتے ہیں۔ مشہور شاہراہ CHAPMS- ELEYSEES کو شانز الیزے بولتے ہیں۔ MONT MARTRE کے مشہور گرجا گھر کو مومارت بولتے ہیں۔ VERSAILLES ان کے پاس صرف ورسائی بن جاتا ہے۔ اسی لئے ہم فرانسیسی نام پڑھ لیتے تھے لیکن ان کا نام اپنی زبان پر نہ لاتے تھے۔

خیر لوف کے میوزیم سے ہم حیرت زدہ ہو کر نکلے تو ایفل ٹاور جا پہنچے۔ ۳۲۰ میٹر اونچا ٹولا دی ٹاور ۱۸۸۹ء میں بنا تھا۔ اس کے اوپر چڑھ جایئے تو نہ صرف سارا پیرس دکھائی دیتا ہے بلکہ پیرس کے بہت سے نواحی علاقے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ پیرس میں ہر جگہ سے دکھائی دیتا ہے۔ ایک انگریز ادیب نے ایفل ٹاور کے بارے میں لکھا تھا کہ پیرس میں اس بدنما ڈھانچے کے دیدار سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود ایفل ٹاور پر جا کر بیٹھ جائے۔ ایفل ٹاور کے سامنے دریائے سین بہت سلیقے سے بہتا ہے۔ دریا کے پل کو عبور کر کے آگے نکل جایئے تو پیلے دی شیو آتا ہے۔ یہاں نیشنل تھیٹر ہے اور کئی قسم کے میوزیم ہیں۔ یہ عمارتیں ۱۹۳۷ء میں بنی تھیں۔ یہ پیرس کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے۔ بالخصوص رات میں تو اس کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم بہت دیر تک دریائے سین کے کنارے کھڑے رہے۔ یوروپ کے اکثر دریا ہمیں نہایت شریف اور مہذب نظر آئے۔ سین میں اس وقت کئی جہاز چل رہے تھے۔ شام ہونے کو تھی۔ یوں بھی سوبورن یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالماجد آٹھ بجے گھر آنے والے تھے۔ وہ ٹھیک وقت پر آئے۔ سوچا تھا کہ ان سے ادب کلچر وغیرہ پر بات ہوگی مگر وہ مسرور خورشید کے بنائے ہوئے حیدرآبادی کھانوں کے ذائقے میں کچھ اس طرح کھو گئے کہ ادب کا نمبر ہی نہیں آیا۔ پروفیسر عبدالماجد خود بھی حیدرآبادی ہیں۔ غالباً آزادی سے پہلے پیرس چلے گئے تھے۔ حیدرآباد کا حال پوچھا۔ ہم نے فرانسیسی ادب کا حال پوچھنا چاہا تو وہ حیدرآبادی کھانوں کا ذکر لے بیٹھے۔ ہم نے بھی علم و ادب کو دور رکھا اور حیدرآبادی کھانوں میں کھو گئے۔ ہم فرانس کے بارے میں کوئی سوال کرتے تو وہ جواب میں حیدرآباد کی کسی چیز کے بارے میں سوال کرنے لگتے تھے۔

● ● ●

حیدرآباد کا جوذکر کیا

صاحبو! ہمیں حیدرآباد کو چھوڑے ہوئے تیرہ برس بیت گئے۔ اب ہم زندگی میں ٹھوکریں کھانے کے لئے حیدرآباد کی نہیں بلکہ دہلی کی سڑکوں کو زحمت دیتے ہیں۔ پھر بھی سال میں دو تین موقعے ایسے ضرور آجاتے ہیں جب ہم حیدرآباد کی سڑکوں پر پھر سے ٹھوکریں کھانے کے لئے آجاتے ہیں کیونکہ ٹھوکریں کھانے کے لئے اس سے بہتر سڑکیں کسی اور شہر میں دستیاب نہیں ہیں۔ انیتر ہ برسوں میں حیدرآباد میں کیا تبدیلی آئی اور کیا نہیں آئی یہ ہم نہیں جانتے۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ تیرہ برس پہلے ہمارے گھر کے سامنے مین ہول کا جو ڈھکن غائب تھا وہ ہنوز غائب ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک پبلک نل بھی تھا بلکہ اب بھی ہے۔ تیرہ برس پہلے عوام کو اس نل کی ٹونٹی کو بار بار کھولنے میں دشواری پیش آتی تھی لہٰذا کسی نے عوام کی سہولت کی خاطر اس کی ٹونٹی غائب کردی تھی۔ یہ ابھی تک غائب ہے۔

ہمارے گھر کے سامنے بیس برس پہلے ایک دیوار پر منجن بنانے والی ایک کمپنی نے اپنے منجن کا اشتہار جلی حروف میں لکھوایا تھا۔ ہم یہ منجن تو استعمال نہیں کرتے تھے مگر اجنبیوں کو اپنے گھر کا پتہ سمجھانے کے لئے اس اشتہار کو ضرور استعمال کرتے تھے۔ یہ اشتہار اب بھی وہیں موجود ہے۔ اگرچہ منجن بنانے والی کمپنی کب کی مرچکی ہے مگر ہمارا پتہ ابھی تک زندہ ہے۔ اس منجن کو استعمال کرنے والے بھی شاید اب اس دنیا میں زندہ نہیں ہیں۔ اگر یہ مرے نہیں ہیں تو ان کے دانت ضرور گر گئے ہوں گے کیونکہ منجن کی خاصیت بلکہ خوبی ہی ایسی تھی۔

یوں تو کہنے کو حیدرآباد جوں کا توں موجود و محفوظ ہے لیکن اس کے باوجود ادھر چند برسوں سے جب بھی ہم حیدرآباد آتے ہیں تو حضرت جگر مرادآبادی کی طرح ہمیں بھی یہاں کی ہر شے میں کسی

شے کی کمی نظر آتی ہے۔ حیدرآباد وہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب حیدرآباد میں ہمیں خود حیدرآباد کی کمی نظر آتی ہے۔ تیرہ برس پہلے شام کو معظم جاہی مارکیٹ پر نکلتے تھے تو ہر چند قدم کے بعد کوئی نہ کوئی ملنے والا پیچھے سے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا تھا کہ "بھیا! کہاں چلے، کیسے ہو؟ کس حال میں ہو؟" اب معظم جاہی مارکیٹ پر نکلتے ہیں تو اس کی سڑک تو وہی ہے مگر وہ ہاتھ جو پیچھے سے ہمارے کندھے پکڑ لیتا تھا کہیں غائب ہو گیا ہے۔ بہت ہوا تو اتنا ہوتا ہے کہ کوئی رکشا والا اچانک ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دے دیتا ہے کہ "ابے سڑک پر کدھر چلتا ہے۔ فٹ پاتھ پر چل۔" فٹ پاتھ پر جاتے ہیں تو کوئی بزرگ ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں "ارے میاں! کیا اندھے ہو گئے ہو۔ دیکھتے نہیں فٹ پاتھ پر پردہ دار خواتین بیٹھی ہیں۔ سڑک پر جاؤ۔" ادھر کئی برسوں سے ہم حیدرآباد میں اس محبت بھرے ہاتھ کی تلاش میں ہیں جس کی اچانک گرمی ہمیں اس شہر سے جوڑ دیتی تھی۔

ہمیں یاد ہے کہ پچھلے سال مارچ میں لندن کی ایک سرد شام کو آکسفورڈ اسٹریٹ سے گذر رہے تھے کہ ہو بہو ایسا ہی ایک نرم گرم ہاتھ ہمارے کندھے پر رکھا گیا۔ پیچھے پلٹے بغیر ایک لمحہ کے لئے سوچتے رہے کہ ایک اجنبی شہر میں یہ کیسا اجنبی ہاتھ ہے جس کا لمس جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری نوجوانی کا دوست مجید اپنے بالوں میں چاندی سجائے کھڑا ہے۔ اس نے ہم سے بے ساختہ بغل گیر ہوتے ہوئے کہا "ارے تم! تم آکسفورڈ اسٹریٹ پر کیسے آ گئے؟"

ہم نے کہا "یار! میں لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ پر کہاں ہوں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میں کئی برسوں بعد حیدرآباد کی عابد روڈ پر کھڑا ہوں۔ میں تو تمہیں عابد روڈ پر ڈھونڈتا رہا اور تم لندن میں کیا کر رہے ہو؟"

مجید بولا "یار! بیس برس سے لندن میں ہوں اور تم مجھے ابھی تک عابد روڈ پر ڈھونڈتے ہو۔ عجیب احمق ہو۔ اچھا یہ بتاؤ لندن میں کہاں ٹھہرے ہو۔ اپنا پتہ دو۔ ایک دن میرے گھر چلو۔

خالص حیدرآبادی کھانا کھلاؤں گا۔"

ہم نے کہا "یار! لندن آئے ہوئے بیس دن ہو گئے۔ ان بیس دنوں میں اتنے حیدرآبادی کھانے کھائے ہیں کہ خود حیدرآباد میں بھی پچھلے تیرہ برسوں میں نہ کھائے ہوں گے۔ کھلانا ہی ہو تو انگریزی کھانا کھلاؤ۔ میں تو انگریزی کھانا کھانے کے لئے ترس گیا ہوں۔"

مجید بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دو حیدرآبادی پردیس میں ملیں اور بگھارے بینگن بیچ میں نہ آئیں۔"

●

سچ پوچھئے تو پچھلے برس یوروپ، امریکہ اور کینیڈا کے دورہ کے بعد ہی ہمیں یہ احساس ہوا کہ جس حیدرآباد کو ہم حیدرآباد کی سڑکوں پر تلاش کرتے پھرتے ہیں وہ تو لندن کی سڑکوں پر ملتا ہے۔ پیرس کی گلیوں میں پایا جاتا ہے۔ شکاگو کے چنچل کوڑہ میں ملتا ہے۔ ٹورانٹو کے بنجارہ ہلز میں پایا جاتا ہے۔

ہمیں اس وقت پچھلے سال ۱۰ مارچ کی وہ شام یاد آرہی ہے جب جنوبی لندن کے ایک ہال میں ہمارے دوست حبیب حیدرآبادی کی بیٹی کی شادی مقرر تھی۔ ہم تقریب عقد میں پہنچے تو یوں لگا جیسے ہم کئی برس بعد حیدرآباد واپس آئے ہیں۔ وہ سارے حیدرآبادی جنہیں ہم حیدرآباد میں ڈھونڈتے پھرتے تھے یا وہ سارے حیدرآبادی جو حیدرآباد میں ہم سے منہ چھپاتے تھے وہ سب کے سب وہاں موجود تھے۔ حیدرآبادی شیروانیوں میں ملبوس حیدرآبادیوں کو دوبارہ زندہ و سلامت پاکر ہمیں کتنی خوشی ہوئی، اس کا حال ہم کیا بیان کریں۔

حیدرآبادی کھانوں اور شامتہ العنبر کی ملی جلی خوشبوؤں میں بسے حیدرآباد کی بازیافت ہمارے لئے ایک انوکھا تجربہ تھی۔ ہمارے ایک حیدرآبادی دوست جن کی مغفرت کے لئے ہم پچھلے کئی برسوں سے دعا کرتے آرہے ہیں وہ ہمیں وہاں نہ صرف زندہ سلامت ملے بلکہ اپنی تیسری انگریز بیوی کا تعارف بھی ہم سے کروایا۔ معلوم ہوا کہ پچھلی دو انگریز بیویوں میں سے ایک تو اللہ کو پیاری ہوگئی اور دوسری کسی اور کو پیاری ہوگئی۔ حبیب حیدرآبادی کی بیٹی کی شادی کی جس

تقریب کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کی خصوصیت یہ تھی کہ دولہا انگریز تھا اور ایک حیدرآبادی لڑکی سے شادی کرنے کی کوشش میں مسلمان ہوگیا تھا۔اس کے اصلی انگریزی نام کے ساتھ اس کے نئے اسلامی نام کو جوڑنے سے اس کا نیا نام ''الفریڈ عرفان'' بن گیا تھا۔چنانچہ شادی کے کارڈ میں دولہا کا نام نورچشم الفریڈ عرفان لکھا گیا تھا۔شادی اسلامی طریقہ سے ہوتی تو کوئی بات بھی تھی مگر یہاں شادی حیدرآبادی رسومات کے مطابق ہو رہی تھی۔دلہن کے ماموں اور ہمارے دوست ڈاکٹر مغنی تبسم نورچشم الفریڈ عرفان کی شادی کا سہرا حیدرآباد سے بطور خاص بنوا کر لے آئے تھے۔ سہرے کو صحیح وسالم حالت میں لندن لانے کی جستجو میں مغنی تبسم کا سوٹ کیس سیرین ائر لائنس کے طیارے میں ہی رہ گیا تھا اور وہ جب سے لندن آئے تھے ایک ہی سوٹ پہن کر شادی کی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔اس حیدرآبادی سہرے کی خوبی یہ تھی کہ اس میں سے دولہا کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ہمارے حیدرآبادی دولہے کبھی کبھی سہرے کو اپنے چہرے سے ہٹا کر باراتیوں کو دیکھ بھی لیتے ہیں مگر نورچشم الفریڈ عرفان نے حیدرآبادی رسومات کا اتنا پاس ولحاظ رکھا کہ کسی نامحرم کی نظر اپنے چہرے پر پڑنے نہیں دی۔دولہے کے انگریز رشتہ داروں اور احباب کی سہولت کی خاطر حیدرآبادی رسومات کی نزاکتوں کے بارے میں سلیس انگریزی زبان میں ایک تقریر بھی کی گئی۔انگریزوں کو بتلایا گیا کہ عقد کے بعد جب چھوہارے اچھالے جائیں تو انہیں لوٹا جائے۔انگریزوں کی نوآبادیات جب سے ختم ہوئی ہیں وہ لوٹ مار کے عادی نہیں رہے۔مگر چھوہاروں کی لوٹ مار میں ان کی فطری صلاحیتیں کام کر گئیں۔ہم نے دو بادام، ایک کھجور اور مصری کی ایک ڈلی لوٹی تھی۔ہم لوٹ کا یہ مال ہاتھ میں لئے بیٹھے تھے کہ ایک انگریز نے اچانک ہمارے ہاتھ کو زبردستی مروڑ کر یہ مال غنیمت حاصل کیا اور بھیڑ میں غائب ہوگیا۔عقد کے بعد ہمارے دوست حبیب حیدرآبادی کی طرف سے عشائیہ کا انتظام تھا۔عشائیہ کیا تھا حیدرآبادی کھانوں کی نمائش تھی۔تین اقسام کی بریانی تھی۔قیمیاں، دہی کی چٹنی، کباب، بگھارے بینگن، دم کا مرغ، ڈبل کا میٹھا، خوبانیوں کا میٹھا، سوئیاں سب کچھ تھا۔اس عشائیہ کی خوبی یہ تھی یہ بلالحاظ مذہب وملت سب کے لئے تھا۔دولہا کے انگریز رشتہ داروں کی خدمت میں بھی یہی حیدرآبادی

کھانا پیش کیا گیا۔ لہٰذا ہم نے دیکھا کہ ایک انگریز دہی کی چٹنی میں ڈبل کا میٹھا ملا کر نہ صرف کھا رہا تھا بلکہ حیدرآبادی پکوان کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ ایک انگریز کباب میں بگھارے بینگن ملا کر کھا رہا تھا۔ ایک اور انگریز مرغ کی ٹانگ کی مدد سے خوبانیوں کا میٹھا کھا رہا تھا۔ انگریز جس طرح حیدرآبادی تہذیب کو کھا رہے تھے، اسے دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آ رہا تھا۔ ہمارے دوست مغنی تبسم نے کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد مہمانوں کے لئے حیدرآبادی پان بھی بنا رکھے تھے۔ یہ پان کھانے کے بعد مہمانوں کو پیش کئے گئے۔ انگریزوں کو آسان انگریزی میں بتایا گیا کہ اگر پان کھانے کے بعد منہ سے لال رنگ کا تھوک نکلے تو اس سے پریشان ہو کر ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریز تھوکنے کو بہت برا سمجھتے ہیں لیکن اس دن بہت سے انگریزوں کو پان کھانے کے بعد پہلی بار پتہ چلا کہ تھوکنا کس کو کہتے ہیں اور تھوکنے کے حیدرآبادی آداب کیا ہیں۔ ایک انگریز دیر سے محفل میں آیا۔ اس نے لوگوں کو پان کھاتے دیکھا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ ہم نے سوچا یہ انگریز تو پان کا بہت شوقین معلوم ہوتا ہے مگر جب اس نے آستین چڑھا کر پان پر پان کھانا شروع کیا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "بھیّا! کھانا وانا کھایا یا نہیں؟" بہت حیرت کے ساتھ ہم سے پوچھنے لگا "کیا اس کھانے کے علاوہ اور بھی کچھ کھانے کا انتظام ہے۔"

غرض لندن میں قیام کے دوران میں ہم نے حیدرآبادی تہذیب کو جس طرح پروان چڑھتے دیکھا اس سے ہمارا دل باغ باغ ہو گیا۔

ہمارے دوست عامر موسوی اور عباس زیدی کے ہاں حیدرآبادی نہاری اور بکرے کی چٹنی زبانیں کھائیں اتنی کبھی اور کہیں نہیں کھائیں۔ عامر موسوی نے ہمیں بتایا کہ حیدرآبادیوں کے لندن آنے سے پہلے انگریز اپنی زبان کی اہمیت سے تو واقف تھے لیکن بکرے کی زبان کی عزت کرنا ہم حیدرآبادیوں سے ہی سیکھا۔ پہلے انگریز قصائی بکرے کی زبان کو پھینک دیتا تھا مگر اب حیدرآبادیوں کے انتظار میں سینت سینت کے ریفریجریٹر میں رکھتا ہے۔ اگر کوئی حیدرآبادی نہیں آتا تو خود کھا لیتا ہے۔ مانا کہ انگریزوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا مگر تم اس بات کو کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ حیدرآبادیوں نے انہیں بکرے کی زبان کھانے کا گر سکھایا۔ حیدرآبادیوں کے آنے

سے پہلے انگریز دنیا کی ایک بڑی لذت سے محروم تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب بعض انگریز بھی صبح کو کھچڑی، خاگینہ، آچار اور املی کی چٹنی، پاپڑ وغیرہ کھانے لگے ہیں۔ لندن میں ہمارا قیام، قیام الدین کے ہاں تھا اور وہ لندن میں مقیم ہی اس لئے تھے کہ یہاں رہ کر خالص اشیاء کی مدد سے لذیذ حیدرآبادی کھانے بنائے جاسکتے ہیں۔

لندن تو خیر لندن ہے پیرس میں ہم چار دن کے قیام کے لئے اپنے دوست مسرور خورشید کے ہاں پہنچے تو انہوں نے جاتے ہی اپنا ریفریجریٹر کھول کر دکھا دیا کہ بھیا! میں نے اس میں پورے ایک ہفتہ کے حیدرآبادی کھانے پکا کر رکھ دیئے ہیں۔ تم صرف چار دن کیوں رہتے ہو۔ ایک ہفتہ رہو۔ یہ دہی نہاری، یہ رہے بگھارے بینگن، یہ رہی دہی کی چٹنی، یہ دہی کھچڑی اور یہ دہی۔۔۔۔"

ہم نے اپنے اور ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "خدا کے لئے اب حیدرآبادی کھانوں کا ذکر نہ کیجئے۔ مجھے ابکائی آرہی ہے۔ کیا حیدرآبادی تہذیب اب صرف پکوان میں ہی اٹک کر رہ گئی ہے۔"

بولے "یہ بات ہے تو لو مجھ سے مخدوم کے شعر سنو۔ امجد حیدرآبادی کی رباعیات اور شاذ تمکنت کے شعر سنو۔ میں تو ضرورت پڑنے پر کنول پرشاد کنول کے بھی شعر سنا سکتا ہوں۔"

مسرور خورشید کا گھر حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ گھر میں اتنی کتابیں ہیں کہ ان کا پلنگ بڑی مشکل سے گھر میں سما پاتا ہے۔ پیرس میں ہماری آمد کے پیش نظر اپنا پلنگ انہوں نے ہمارے لئے خالی کر دیا تھا اور خود حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر سو جاتے تھے۔ رباعیات امجد کو سرہانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ فرہنگ آصفیہ کو اسٹول کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ کھڑکی کو اچھی طرح بند کرنے کے لئے کلیات قلی قطب شاہ سے استفادہ کرتے تھے۔ حیدرآبادی تہذیب ان کے لئے صرف کھانا ہی نہیں بلکہ اوڑھنا بچھونا بھی تھی۔ پیرس میں پہلے ہی دن پیرس کی سیر کروانے کے لئے ہمیں زمین دوز ٹرین "میٹرو" سے لے کر چلے تو بولے "ذرا اس اسٹیشن کا نام پڑھیے۔" ہم نے رومن رسم الخط میں فرانسیسی نام کو پڑھنے

کی کوشش کی تو پتہ چلا اسٹیشن کا نام "بواسیر" ہے۔ ہم نے کہا "یہ اسٹیشن ہے یا بیماری۔ پیرس کی سیر کا آغاز ہی ہم غلط اسٹیشن سے کر رہے ہیں۔" بولے "کوئی فکر کی بات نہیں ہفل ٹاور سے قریب آپ جس اگلے اسٹیشن پر اتریں گے اُس سے آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی۔" ہفل ٹاور سے قریب اسٹیشن پر اترے تو مسرور خورشید نے کہا "اب اس اسٹیشن کا نام پڑھیے۔" ہم نے نام پڑھا تو تلفظ اس طرح ادا ہوا، "بہرے حکیم۔" ہنس کر بولے "جب ہم بواسیر سے اپنے حیدرآباد کے بہرے حکیم صاحب کے پاس پہنچ رہے ہیں تو اس میں ڈرنا کیسا۔ جو کوئے دار سے نکلے تو سوئے یار چلے۔"

پیرس کی شاہراہ شانز الیزے پر چلتے ہوئے انہوں نے عابد روڈ کا حال پوچھا۔ مامارت کے گرجا گھر پر نوبت پہاڑ کی خیریت پوچھی، لووف کے میوزیم میں سالار جنگ میوزیم کی مزاج پرسی کی۔ وارسائی کے محل میں چومحلہ پیلیس کا حال دریافت کیا۔ سانترے دیم کے گرجا گھر پر آل سینٹس کے گرجا گھر کی خیریت پوچھی۔ ہم نے جوابا فرانس کے صدر مسٹر متراں کا حال پوچھا تو انہوں نے اپنے حیدرآبادی دوست نرسنگ راؤ کا حال پوچھا۔ حیدرآباد مسرور خورشید کو پیرس میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

ہم یوروپ کے حیدرآبادیوں کو نپٹا کر امریکہ پہنچے تو احساس ہوا کہ امریکہ میں شاید ہی کوئی ایسا شہر ہوگا جس میں حیدرآبادی آباد نہ ہوں۔ ہم اپنے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین اور ایک پاکستانی ڈاکٹر فرحت خاں کے ساتھ واشنگٹن سے ساحل میامی تک کے کئی ہزار میل کے سفر پر روانہ ہوئے تو امریکہ کی ریاست جارجیا سے گذرتے ہوئے ہمیں شام کے وقت ایک چھوٹا سا قصبہ دکھائی دیا۔ غالباً تلادیگا نام تھا اس کا۔ پشاور کے ڈاکٹر فرحت خاں کو یہ شکایت ہے کہ حیدرآبادی نہ صرف سارے امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں بلکہ ان کی تعداد امریکہ کے اصلی باشندوں ریڈ انڈینس سے بھی زیادہ ہے۔ اگر کہیں سے پتھر اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے ایک حیدرآبادی فرشی سلام کرتا ہوا برآمد ہوتا ہے۔ ہم نے کہا "اس وقت ہم جس چھوٹے سے قصبہ سے گذر رہے ہیں اس کی آبادی ہزار دو ہزار نفوس پر مشتمل ہوگی اس میں تو کوئی حیدرآبادی نہیں ہوگا۔"

فرحت خاں بولے "لگائیے اسی بات پر شرط۔"

ہمارے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "شرط نہ لگائیے۔ آپ نقصان میں رہیں گے۔ ہمیں آج کی رات اسی قصبہ میں رکنا ہے۔ میرا ایک حیدرآبادی دوست ڈاکٹر اسد یہاں رہتا ہے۔"

ڈاکٹر اسد جو چنچل کوڑہ کے رہنے والے ہیں اس چھوٹے سے قصبہ میں ایک ایسے مکان میں رہتے ہیں جو محل سے کم نہیں۔ گھر کے باہر تین چار موٹریں کھڑی تھیں۔ بہت خوش ہوئے مگر ان سے زیادہ ان کے والد ہم سے مل کر خوش ہوئے جو چھ مہینوں سے امریکہ کے اس چھوٹے سے قصبہ میں رہ رہے تھے۔ کہنے لگے چھ مہینوں سے اپنے بیٹے کے سوائے کسی اور حیدرآبادی کی صورت نہیں دیکھی۔ میں تو امریکہ کی آسائشوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ چنچل کوڑہ بہت یاد آتا ہے۔ ایک دو مہینوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ دوسرے دن صبح کو وہ اپنے بیٹے کا مکان اور جائیداد بالتفصیل دکھانے لے گئے۔

ایک ٹیلہ پر کھڑے ہو کر انہوں نے کہنا شروع کیا "وہ جو پہاڑ آپ دیکھ رہے ہیں وہ میرے بیٹے کے ہیں۔ وہ جو بادلوں کے نیچے جنگل نظر آ رہے ہیں وہ میرے بیٹے کے ہیں۔ یہ جو جھیل بہہ رہی ہے، وہ بھی میرے بیٹے کی ہے۔"

ہم نے بڑے میاں کی بات کو کاٹ کر کہا "اور وہ جو آسمان میں سورج چمک رہا ہے وہ کس کا ہے؟"

فوراً اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے "نعوذ باللہ! اس سورج سے میرے بیٹے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کسی اور کا ہے۔"

شکاگو میں ہی ہمیں اپنے پرانے دوست عزیز الرحمٰن ملے، جنہوں نے اپنے اطمینانِ قلب کے لیے ٹھیٹ حیدرآبادی گالیوں کا ٹھیٹ انگریزی میں ترجمہ کر رکھا ہے، جنہیں وہ آئے دن ہسپانوی ٹیکسی ڈرائیوروں کو پابندی سے دیتے رہتے ہیں۔ ہم نے پوچھا "ہسپانوی ڈرائیور

مارا نہیں تو نہیں ہوتے؟"

بولے "سچ پوچھئے تو حیدرآبادی گالیوں میں اتنی تجرید ہوتی ہے کہ یہ جب اردو میں ہی بری نہیں معلوم ہوتیں تو ترجمہ کی چھلنی سے گذرنے کے بعد انگریزی میں کیا بری معلوم ہوں گی۔ میں نے تو بس اپنے اطمینانِ قلب کے لیے ان کا ترجمہ کر رکھا ہے۔ چلو اپنے ڈھنگ سے گالی دے دی اور وطن مالوف سے اپنا رشتہ بنائے رکھا۔"

ہمیں شکاگو کے چنچل کوڑہ میں بھی جانے کا موقع ملا۔ یہاں زیادہ تر وہی لوگ رہتے ہیں جو پہلے حیدرآباد کے چنچل کوڑہ میں رہتے تھے۔ اس میں اور حیدرآباد کے چنچل کوڑہ میں کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔ ایک صاحب نے اسی چنچل کوڑہ میں کھانے پر بلایا تھا۔ ہم نے ان سے پوچھا "یہ کیسا چنچل کوڑہ ہے جہاں بھینسیں نہیں بندھی ہوئی ہیں۔؟"

بولے "بھینسیں تو ہمارے ذہنوں میں بندھی ہوئی ہیں۔"

پوچھا "تو پھر دودھ بھی وہی دیتی ہوں گی۔"

ایک آہ بھر کر بولے "اب اس ذکر کو جانے دیجئے۔ کھانا شروع کیجئے۔ اللہ دیا ہے۔"

اچانک اس "اللہ دیا" کو سن کر ہمیں یقین آگیا کہ ہم سچ مچ حیدرآباد کے چنچل کوڑہ میں بیٹھے ہیں۔ ہم نے ان صاحب سے کہا "مگر ذرا سوچئے کہ اللہ نے آپ کو جو کچھ بھی دیا ہے وہ حیدرآباد سے کتنی دور لا کر دیا ہے۔"

اپنی آنکھوں میں آنسو لا کر بولے "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر اللہ نے اس کا دسواں حصہ بھی ہمیں حیدرآباد میں دیا ہوتا تو ہم چنچل کوڑہ کی گلیاں چھوڑ کر یہاں کیوں آتے۔"

ہم نے بات کو اور آگے نہیں بڑھایا کیونکہ آنسو ان کی پلکوں پر چھلکنے کو بیقرار تھے۔ اور ہمیں یوں لگا جیسے حیدرآباد ایک شہر نہیں پھیل کر کائنات بن گیا ہے۔

● ● ●

ایروفلوٹ میں ہمارا پہلا سفر

محبان سوویت یونین (FRIENDS OF SOVIET UNION) کے سکریٹری جنرل کے. آر گنیش ہمارے کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو یہ وہی کے۔ آر۔ گنیش ہیں جو سابق میں مرکزی وزیر فینانس رہ چکے ہیں۔ اپنے دور وزارت میں انہوں نے اسمگلنگ کے خلاف کچھ ایسے اقدامات کئے تھے کہ اسمگلر انہیں اب تک یاد کرتے ہیں۔ اس امتیازی وصف کے علاوہ وہ آرٹ، ادب اور بالخصوص اردو ادب کا بہت ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسمگلروں اور اردو ادیبوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ایک دن انہوں نے ہم سے پوچھا ''آپ کبھی سوویت یونین گئے ہیں۔''

ہم نے دل ہی دل میں سوچا، ہم کوئی ہیون سانگ، فاہیان یا ابن بطوطہ تھوڑے ہی ہیں کہ اپنے بال بچوں اور عزیز و اقارب کو چھوڑ، کندھوں پر ایک جھولا ڈال نئی نئی دنیاؤں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں اور جب برسوں بعد زندگی کی شام ڈھلے واپس ہوں تو پتہ چلے کہ مسافر کی جھولی میں سفر کی یادیں تو بہت ہیں لیکن وطن میں عزیز و اقارب اور بال بچوں کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ سیاحت ان کے لئے ایک نصب العین تھی۔ ہمارے لئے ایک تفریح ہے۔ پھر کسی ہیون سانگ یا کسی ابن بطوطہ کے ساتھ یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ کسی اجنبی دھرتی پر پہنچتا تھا تو وہاں کا حاکم اس کے ذوق سفر سے خوش ہوکر اس کا منہ موتیوں سے بھر دیتا تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب اجنبی دیس کا حاکم الٹا سیاح کے سینہ یا پیٹ میں چھپے ہوئے موتیوں یا ہیرے جواہرات کو نکال لیتا ہے۔ (ہمارا اشارہ کسٹم والوں کی طرف ہے) ہمارے ہاں ذوق سفر تو بہت ہے لیکن اذوقہ سفر کی ہمیشہ کمی رہی۔

سو ہم نے کچھ دیر سوچ کر کہا "گنیش جی! مانا کہ ہم نے ملکوں ملکوں کی خاک ضرور چھانی ہے لیکن اسی وقت چھانی ہے جب اس خاک کو چھاننے کا معاوضہ یعنی کرایہ آمد و رفت کسی اور نے ادا کیا ہو۔ ہم تو کب سے سوویت یونین جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں لیکن کسی ملک میں بن بلائے چلے جانا ہماری فقیرانہ شان کے خلاف ہے۔ آپ تو اب ہمارے سوویت یونین جانے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایک زمانہ ہم پر ایسا بھی گذرا ہے جب ہم سالم روس اور اس کے انقلاب کو خود ہندوستان میں لانے کی بابت سوچا کرتے تھے۔" گنیش جی ہماری بات کو سن کر خاموش ہو گئے جیسا کہ ان کی عادت ہے اور بعد میں ایک دن اچانک گنیش جی کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ بیرونی ممالک سے دوستانہ و ثقافتی تعلقات کی مرکزی سوویت انجمن اور سوویت یونین کی سوویت رہندو دوستی انجمن نے ان کی اس تجویز کو مان لیا ہے کہ اردو کے ادیبوں اور دانشوروں کے دو وفود کو سوویت یونین کا دورہ کرنے کی دعوت دی جائے۔ پہلا وفد دو ارکان پر مشتمل ہوگا ایک رکن تو آپ ہیں اور دوسرے رکن ہیں پروفیسر اشتیاق عابدی۔ ۲۷ ستمبر کو جانا ہوگا۔ کوچ کرنے کی تیاری کیجئے۔ اس اطلاع سے ہمیں دوہری مہمیز لگی۔ ایک تو سوویت یونین کا سفر اور اوپر سے اشتیاق عابدی جیسا ہمسفر نصیب آ جائے تو کیا کہنے۔ وہ ہمارے ہم نوالہ، ہم پیالہ، ہم دم، ہم مشرب اور ہم مشروب تو ہیں ہی اب ہم رکاب اور ہم رکابی بھی بن جائیں گے۔ ہم رکابی پر ہمارا زور اس لئے ہے کہ وہ ہم جیسے ملنگوں کے دوست ہونے کے باوجود ماڈرن فوڈ انڈسٹریز کے چیرمین ہیں۔ سفر میں اور وہ بھی بیرونی سفر میں یہ طمانیت کیا کچھ کم ہے کہ ہماری ماڈرن بریڈ ہمارے ساتھ رہے گی۔

صاحبو! اس پس منظر کے ساتھ اب ہم سوویت ایر لائنس، ایرو فلوٹ کے وسیع و عریض طیارے میں بیٹھے ہیں۔ اس طیارے کو ہم نے اکثر اپنے گھر کے اوپر سے گذر کر دہلی کے ہوائی اڈے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی ساخت اور آواز دنیا کے مروجہ دیگر طیاروں سے مختلف ہوتی ہے۔ ہم تو اپنے گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی پتہ چلا لیتے ہیں کہ ایرو فلوٹ کا طیارہ ہماری

چھت پر سے گذر رہا ہے۔

تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

ہم نے دنیا کی کئی ایرلائنز میں سفر کیا ہے لیکن ایروفلوٹ میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقع ہے۔ لوگوں نے کہہ رکھا ہے کہ ایروفلوٹ کی ہوائی حسیناؤں کے ہونٹوں پر اتنی مسکراہٹ نہیں ہوتی جتنی کہ ایئر لائنز کی ہوائی حسیناؤں کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔ مسکراہٹ پر یاد آیا کہ بنکاک سے دہلی کے سفر میں تھائی ایرویز کی ایک موٹی سی ایر ہوسٹس تو ہم نے ایسی بھی دیکھی تھی جس کے ہونٹ ہی نہیں اس کی آنکھیں تک مسکراتی تھیں۔ پیٹائی کھلکھلاتی تھی اور ابرو ٹھٹھا مارتے تھے۔ اس کی آواز تک تبسم ریز تھی۔ غرض اس کارواں رواں ہمیں مسکراتا اور کھلکھلاتا ہوا ملا۔ اس بے نام و بے منزل مسکراہٹ کی یاد اب بھی ہماری آنکھوں کو کبھی کبھی لبریز کر دیتی ہے۔ خیر ہمیں اب مسکراہٹوں سے کیا لینا دینا ہے۔ جو دے اس کا بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ یوں بھی ہمیں تین گھنٹوں بعد ناشقند میں اتر جانا ہے۔ ایر ہوسٹس دانے ڈنکے کو پوچھ لے یہی کافی ہے۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ ایروفلوٹ کے طیاروں میں بیٹھنے کے لئے وہ فراغت نہیں ہوتی جو عام جمبو جٹ طیاروں میں ہوتی ہے۔ پاؤں تو آپ پسار ہی سکتے ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ آپ کو دیکھنے والے کو یہ گمان گذرے کہ آپ رحلت فرما چکے ہیں اور یہ کہ آپ کی بے گور و کفن نعش نشست پر بے حس و حرکت پڑی ہے۔ طیاروں میں ہم اس انداز نشست و برخاست کے قائل نہیں ہیں۔ اس لئے ایروفلوٹ کی نشستیں کم از کم ہماری شخصی شائستگی اور ذاتی تمدن کے عین مطابق نظر آئیں۔ آدمی پاؤں پسارے گا بھی تو باہر تھوڑا ہی جائے گا اور میاں یہ طیارہ ہے کوئی گھر تو ہے نہیں کہ آپ کھانے کی میز پر پاؤں رکھے کود میں کھانے کی پلیٹ سجائے کھانا کھانے لگ جائیں۔ یہ سب پیٹ بھروں کے چونچلے ہیں ہم تو بسوں کے ڈنڈوں سے لٹک کر سفر کرنے کے عادی ہیں۔ اب ایروفلوٹ میں کشادہ اور آرام دہ نشستوں کے طلبگار کیونکر ہوں۔

ہمارا حلقہ احباب کتنا وسیع ہے اس کا اندازہ تو ہمیں طیارے کے اندر پہنچنے پر ہی ہوا۔ ایک

طرف ہمارے یار دلدار ارجن دیو بیٹھے ہیں جو تاریخ کے پروفیسر ہیں، دوسری طرف تلگو دیشم کے رکن پارلیمنٹ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں سماجیات کے پروفیسر ڈاکٹر لکشمنا بیٹھے ہیں۔ یہ دونوں برلن میں ہونے والی کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہے ہیں۔ تیسری طرف ہفتہ وار نئی دنیا کے ایڈیٹر شاہد صدیقی اور صحافی شمس الزماں بیٹھے ہیں جو باکو میں ہونے والی کسی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیئے جارہے ہیں۔ مولانا اسحاق سنبھلی بھی یہیں کہیں ہیں۔ اگلی نشستوں پر محترمہ شیلا کول سابق مرکزی وزیر تعلیم بھی براجمان ہیں جو تاشقند میں ہونے والی خواتین کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہی ہیں۔ باقی وہ مسافر ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے مگر قیاس اغلب ہے کہ وہ بھی یقیناً کسی اچھی سی کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہے ہوں گے۔

طیارے کو رات کے دس بج کر ۴۰ منٹ پر اڑنا تھا لیکن روانگی میں دیر ہوتی چلی جارہی ہے۔ ایر فلوٹ کی ہوائی حسیناؤں نے اچانک مسافروں کو گننا شروع کردیا۔ ہم نے کہا یا اللہ یہ مسافروں کو گننے کا کیا سلسلہ ہے۔ پھر سب کے ٹکٹوں کو چیک کرنے کی باری آئی۔ روسی زبان میں کچھ اعلان بھی ہوا۔ انگریزی میں بھی کچھ بولا گیا جس پر روسی لہجہ کا کلف کچھ اتنا زیادہ چڑھا ہوا تھا کہ اپنے مطلب کی انگریزی ہمارے پلے نہیں پڑی۔ کسی نے کہا "شاید کوئی مسافر بلا ٹکٹ سوار ہوگیا ہے اس کی تلاش ہورہی ہے۔" پھر ایر ہوسٹس نے بعض مسافروں کو اٹھا کر کچھ پوچھنا شروع کیا۔ یہ معمہ کچھ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں ایر ہوسٹس ہاتھوں میں کوئی آلہ پکڑے نمودار ہوئیں اور طیارے کی رہداری میں ایک سرے سے دوسرے تک آلہ کے بٹن کو دباتی اور چھوڑتی ہوئی چلنے لگیں۔ ان آلوں کے بجنے کی آواز سے یوں لگا جیسے سویرا ہوگیا ہے اور چڑیوں نے چہچہانا شروع کردیا ہو۔ ہم نے اشتیاق عابدی سے پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے۔"

وہ بولے "طیاروں کے اغوا کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پیش نظر یہ کوئی احتیاطی تدبیر لگتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس آلہ کے ذریعہ ہتھیاروں کا پتہ چلایا جارہا ہو۔" یہ سنتے ہی ہمارے پسینے چھوٹ گئے کیونکہ ہماری جیب میں چابیوں کا جو چھلا رکھا ہوا ہے اس میں ایک چھوٹا سے چاقو بھی

موجود ہے۔ یہ چاقو ہم نے طیارہ کو اغوا کرنے کے ارادہ سے نہیں رکھا بلکہ اس کا مقصد ناشپاتی، امرود اور اسی قسم کے دیگر پھلوں کو کاٹنا ہے۔ مبادا یہ نہ سمجھئے کہ ہم پھل کھانے کے بہت شوقین ہیں۔ یاد آتا ہے کہ زندگی میں صرف ایک بار چاقو کی مدد سے ایک سیب کو کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ سیب تو نہیں کٹا تھا البتہ انگلی ضرور کٹ گئی تھی۔ اب جو یہ چاقو بھی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں تو اس کا پس منظر صرف اتنا ہے کہ دوستوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ ازبکستان میں پھل بہت ملتے ہیں۔ تمہارے سامنے پھل تو بہت ہوں گے اور چاقو تمہارے پاس نہ ہو تو کیا کرو گے؟ ہندروس دوستی کے سچے جذبہ کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ پھل اگر سوویت یونین کے ہوں تو ان پھلوں کو کاٹنے کے لئے جو چاقو استعمال ہو وہ کم از کم ہندوستانی ضرور ہونا چاہیے۔ یکطرفہ دوستی یوں بھی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ لہٰذا دوطرفہ دوستی کے ثبوت کے طور پر یہ چاقو ہماری جیب میں پڑا ہوا ہے۔

طیارہ کی روانگی میں ایک گھنٹہ کی تاخیر ہو گئی تھی کہ اچانک طیارہ نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ اب ہم ہوا میں ہیں۔ زمین سے جب بھی ہمارا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو نہ جانے یہ دھرتی اتنی خوبصورت کیوں نظر آنے لگتی ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ طیارہ جب اپنی مقررہ اونچائی پر پہنچ جائے گا تو ہمیشہ کی طرح ہوائی حسینائیں اچانک جلوہ گر ہوں گی اور یہ بتانا شروع کریں گی کہ ہوائی حادثہ کی صورت میں آپ کو کدھر سے راہ فرار اختیار کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں ہوائی حسیناؤں کی یہ مشقیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ جب بہت دیر تک ایر ہوسٹس جلوہ افروز نہ ہوئیں تو کسی نے بتایا کہ ایر فلوٹ میں یہ تماشے نہیں دکھائے جاتے۔ جب کوئی حادثہ ہوتا ہی نہیں تو خواہ مخواہ مسافروں کا دل کیوں دہلایا جائے۔ ہم نے کہا "اگر حادثہ نہیں ہوتا تو کرتب نہ دکھاؤ۔ تمہاری مرضی۔ مگر خدا کے لئے کھانا تو کھلا دو۔ اب طیارے کو دھرتی سے اٹھ آئے کوئی ایک گھنٹہ بیت چکا ہے۔ ساڑھے بارہ بجنے کو ہیں۔ ہوائی سفر کی ریت میں ہم کھانا کھائے بغیر آٹھ بجے ہی ہوائی اڈہ پر آ گئے تھے۔"

کسی نے کہا "ایر فلوٹ میں کھانا مسافر کی بھوک کے حساب سے نہیں آتا بلکہ جب ایر ہوسٹس کو بھوک لگے گی تو وہ خود بخود کھانا لے آئے گی۔"

ابھی ہم اس دلچسپ ریمارک سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ ایر ہوسٹس اپنے پورے مطبخ اور تام جھام کے ساتھ نمودار ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری نشستوں پر لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ہمیں تو ایر وفلوٹ کا کھانا بھی اچھا لگا۔ لوگوں نے خواہ مخواہ ہی ایر فلوٹ سے ڈرا رکھا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر گھڑی دیکھی تو ہوائی سفر کے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ پون گھنٹہ یا ایک گھنٹہ اور بیت جائے تو ہم تاشقند میں ہوں گے۔

کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہم شاید ہمالیہ سے گذر رہے ہیں۔ یہیں کہیں سے صدیوں پہلے آریہ ہندوستان آئے تھے۔ سکندر اعظم بھی دنیا کو فتح کرنے کے ارادہ سے یہیں سے گذرا تھا۔ کتنی تکلیفیں اٹھا کر آیا تھا۔ اس زمانے میں ایر فلوٹ کہاں تھی کہ کسٹم کی جانچ اور سیکوریٹی چیک کروا کے پلک جھپکتے میں حفاظتی پیٹی باندھ کر چلا آتا۔ نیچے اس علاقہ میں کہیں وہ غار بھی ہوگا جس میں ناکام و نامراد تیمور لنگ دشمنوں سے گھبرا کر پناہ لینے آیا تھا اور اس کی ملاقات اس چیونٹی سے ہوئی تھی جو اناج کے ایک وزنی دانہ کو اٹھا کر اوپر لے جانے کی کوشش میں بار بار نیچے گر جاتی تھی۔ سینکڑوں بار وہ گری مگر بالآخر دانہ کو اوپر لے جا کر ہی دم لیا۔ چیونٹی نے اناج کے اس دانہ کے ساتھ کیا سلوک کیا مورخین اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ چیونٹی کا یہ عزم اور حوصلہ بعد میں تیمور لنگ کا عزم اور حوصلہ بن گیا۔ وہ غار سے نکلا تو امیر تیمور بن چکا تھا۔ اس کی سلطنت سارے وسط ایشاء کی سرحدوں کو پھلانگ گئی۔ ملک گیری کے شوق میں اس نے جگہ جگہ انسانی سروں کے مینار کھڑے کئے۔ تاریخ امیر تیمور کو یاد کرتی ہے لیکن چیونٹی کو بالکل بھول جاتی ہے۔ یہ ہمارے کانوں میں کیسی آوازیں آ رہی ہیں۔ کہیں یہ چنگیز خاں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز تو نہیں ہے۔ وہ بھی تو اپنے دو لاکھ گھڑ سواروں کے جمِ غفیر تہذیبوں کے نشان مٹاتا ہوا یہیں سے تو گذرا تھا۔ نہ جانے وہ گھوڑے کیا ہوئے۔ تاریخ ان گھوڑوں کی شجاعت کو یاد نہیں کرتی۔ صرف چنگیز خاں کو یاد کرتی ہے۔ شاید یہ چنگیز خاں کا ہی لشکر ہے۔

ذرا سنو کیسی ہیبتناک آوازیں آ رہی ہیں۔ ارے نہیں یہ تو ایروفلوٹ کے طیارے کے نیچے اترنے کا سلسلہ ہے۔ تاریخ کے صفحو! اب ٹھہر جاؤ۔ ہمارے ذہن میں الٹے پلٹنے کی کوشش نہ کرو۔ ہمیں تاشقند کی جگمگاتی روشنیوں میں کھو جانے دو۔ حدِ نظر تک کیسی خوشنما اور دلآویز روشنیاں ہیں۔ حال کی روشنی جب سامنے ہو تو ماضی کی تاریکیوں کو کون یاد کرے۔ با ادب با ملاحظہ ہوشیار! اب ہم کچھ ہی دیر میں ازبکستان کی راجدھانی تاشقند میں اترنے والے ہیں۔ پتہ نہیں یہ شہر ہمیں کیسی کیسی یادیں عطا کرنے والا ہے۔ ہم اس شہر کو فتح کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں، ہمارے ساتھ نہ لاؤ لشکر ہے نہ تام جھام۔ ہم تو اپنا دل ہتھیلی میں لئے اس شہر نگاراں کے دروازے پر کھڑے ہیں۔

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

ہم تاشقند سے بول رہے ہیں

ہم تاشقند کے ہوٹل ازبکستان کے کمرہ نمبر ۴۳۷ سے بول رہے ہیں۔ ہندوستانی وقت کے مطابق ہم رات کے تین بجے تاشقند پہنچے تھے۔ ازبکستان اور ہندوستان کی دوستی کی انجمن کے سکریٹری اسیائیو الیگزینڈ رووچ ہمیں لینے کے لیئے ہوائی اڈے پر آ گئے تھے۔ وہ بڑے تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ ہم سے ملنا چاہتے تھے لیکن ہم نے انہیں منع کیا کہ رات کے تین بجے ہمارے پاس انہیں جوابی تپاک نہیں ملے گا۔ اس رسم کو صبح کے لئے اٹھا رکھئے۔ خوابیدہ تاشقند کو اور اس کی وسیع شاہراہوں اور اونچی عمارتوں کو اپنی نیم خوابیدہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ہوٹل پہنچے۔ الیگزینڈ رووچ نے ہم سے کہا کہ ہم اپنی گھڑیوں کو بیس منٹ آگے کر کے ابن الوقت بن جائیں کیونکہ تاشقند کا وقت دہلی کے وقت سے بیس منٹ آگے ہے۔ آج ہی سے نیا وقت لاگو ہوا ہے۔ اگر آپ ایک دن پہلے آجاتے تو آپ کو اپنی گھڑیوں کو ایک گھنٹہ بیس منٹ آگے کرنا پڑتا۔ ہم نے کہا چلو بچت کی کوئی صورت تو نکل آئی ورنہ ہم تو ہمیشہ گھاٹے کا سودا کرتے آئے ہیں۔ بیرونی سفر میں ہمیں اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ ہماری گھڑی کو ہوتی ہے۔ پھر یہ تو سوویت یونین ہے جہاں وقت کے سات مطلعے ہیں۔ اس کے مشرق کے شہر اور مغرب کے شہر کے درمیان وقت کے معاملے میں تقریباً سات گھنٹوں کا فرق ہے۔ جو ملک دو براعظموں میں پھیلا ہوگا اس کا یہی حشر ہوگا۔ الیگزنڈر، ہوٹل سے جانے لگے تو اس وقت ہماری گھڑی میں تاشقند کے وقت کے حساب سے صبح کے چار بج رہے تھے۔ وہ بولے "صبح ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل کی لابی میں آجایئے۔ دوستی انجمن کے عہدیدار بھی آئیں گے۔ ساتھ میں ناشتہ بھی ہوگا اور دن بھر کا سارا پروگرام آپ کو بتا دیا جائے گا۔"

ہم نے کہا "بندہ خدا! ہم تو آئے ہی سوویت یونین کو دیکھنے کے لئے۔ آپ دکھانے کے

لئے جتنے بے چین ہیں اتنے ہی دیکھنے کے لئے ہم بھی اتاولے ہیں مگر ذرا ہمیں اپنی کمر تو سیدھی کر لینے دو۔ رات اب جانے کو ہے اس کے جاتے جاتے کوئی چھوٹا سا حسین خواب دیکھ لیں تو کیا مضائقہ ہے۔ آٹھ بجے کی بجائے دس بجے ملیں تو کیا رہے گا۔ آپ اطمینان رکھیں اس تبدیلی سے ہندروس دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

ہمیں یاد نہیں کہ الیگزینڈر کے چلے جانے کے بعد ہم نے اپنی کمر سیدھی کی بھی یا نہیں۔ نیند کو لانے کے ان لوازمات کا کسے ہوش تھا۔ آنکھ کھلی تو آٹھ بج رہے تھے۔ کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو صبح بہت روشن تھی۔ دور دور تک اونچے اونچے درختوں کے ساتھ اونچی اونچی عمارتیں نظر آئیں۔ کھڑکی کے سامنے جو وسیع شاہراہ تھی اس پر موٹریں، بسیں، ٹرامیں دوڑی چلی جا رہی تھیں۔ تاشقند کب کا جاگ چکا تھا۔ اس بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھ کر ہم میں چستی اور پھرتی کی لہر سی دوڑ گئی۔ فٹافٹ اپنے آپ کو تیار کیا اور ٹھیک دس بجے لابی میں پہنچے۔ الیگزینڈر وبچ حسب وعدہ لابی میں موجود تھے۔ ان کے ہمراہ ایک متین سنجیدہ اور بردبار خاتون کھڑی تھیں۔ الیگزینڈر نے کہا "ان سے ملیئے یہ ہیں ڈاکٹر لیدیا کیم یکشنس، ماسکو کے بین الاقوامی تعلقات کے انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ہیں۔ یہ مرکزی دوستی انجمن کی طرف سے آپ کے استقبال کے لئے خاص طور پر ماسکو سے آئی ہیں۔ سوویت یونین کے سارے دورہ میں یہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ ان کے ہمراہ ایک اور صاحب کھڑے تھے غفور جہاں گستری۔ تاشقند میں سوویت یونین کا جو سب سے بڑا اشاعتی مرکز "رادوگا" کے نام سے قائم ہے اس میں اردو زبان کے ایڈیٹر اور صدر شعبہ ہیں۔ یہ ازبک ہند دوستی انجمن کی طرف سے آئے تھے۔ ازبکستان کے سارے دورہ میں یہ ہمارے ساتھ رہے۔ ان کے بارے میں الگ مضمون لکھیں گے جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔ فی الحال ڈاکٹر لیدیا کا ذکر ہو جائے۔ ناشتے کی میز پر ہم نے ان سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے سلیس اردو میں جواب دے کر اردو کے مستقبل کے تعلق سے ہماری مایوسی کو وقتی طور پر ہی سہی دور کر دیا۔ پتہ چلا کہ اردو اور ہندی کی اسکالر ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھ چکی ہیں۔ اتنی ہی مرتبہ ہندوستان آ چکی ہیں جتنی مرتبہ ہم دہلی سے حیدرآباد گئے ہیں۔ ہمیں تو

ساٹھ باسٹھ برس کی خاتون نظر آئیں۔ مگر جب ہم نے ان کی عمر پوچھی تو الٹا ہم سے اور اشتیاق عابدی سے ہماری مروجہ عمریں پوچھ بیٹھیں۔ ہم نے اپنی عمر پچاس برس بتائی اور اشتیاق عابدی ۵۶ برس پر رک گئے۔ ڈاکٹر لیدیا کچھ دیر اس طرح سوچتی رہیں جیسے اپنے لئے کسی سہولت بخش عمر کا انتخاب کر رہی ہوں۔ بولیں "میں ۵۴ برس کی ہوں۔" یہ سنتے ہی ہم نے برسر موقع انہیں اپنی بہن بنالیا۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ ہندوستان میں بھی ہماری کوئی بہن نہیں ہے۔ ایک چچازاد بہن تھی جس سے ہم نے بعد میں شادی کر لی۔ اب روس میں آپ جیسی قابل اور لائق بہن مل جائے تو کیا کہنے۔ یوں بھی آپ کے نام کا آخری حصہ یعنی "کبیر یکشنس" بولنے میں کچھ اتنا ثقیل ہے کہ ہماری زبان سے ادا نہ ہوگا۔" کبیر یکشنس" کی جگہ آپا لگا کر "لیدیا آپا" بولا جائے تو آپ کا نام خاصا رواں ہو جائے گا اور ہم کسی خاص محنت مشقت کے بغیر سوویت یونین کے دورہ سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ اشتیاق عابدی بھی "کبیر یکشنس" سے فکر مند تھے۔ بولے میں بھی آپ کو "لیدیا آپا" کہوں گا۔ ہنس کر بولیں "عابدی بھائی! اگر چہ آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں لیکن پھر بھی آپ کے لیدیا کہنے سے دو ملکوں کی دوستی کو فروغ حاصل ہوتا ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

ناشتہ کے بعد ہم تاشقند کی سیر کو نکلے۔ کیا صاف ستھرا اور کشادہ شہر ہے۔ ازبکستان جس کی کود میں کئی تہذیبیں پروان چڑھیں، آبادی کے اعتبار سے سوویت یونین کی چوتھی بڑی جمہوریہ ہے اور اس کی راجدھانی تاشقند کو سوویت یونین کا چوتھا بڑا شہر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ازبکستان کی تاریخ ہزاروں برس پرانی ہے۔ سکندر اعظم بھی یہاں آیا تھا۔ ساتویں صدی میں عرب اسلام کو لے کر یہاں آئے۔ کیسے کیسے عالم، کیسی کیسی جلیل القدر ہستیاں یہاں پیدا ہوئی ہیں۔ آٹھویں صدی کے اختتام اور نویں صدی کے آغاز میں علم الجبرا کے بانی محمد ابن موسیٰ الخوارزم کا مسکن یہی تھا۔ مشہور ریاضی داں احمد الفرغانی بھی اسی عرصہ میں یہاں رہتا تھا۔ مشرق کے ارسطو الفارابی کا وطن بھی یہی تھا۔ مشہور دانشور اور طبیب ابن سینا اور ابوریحان البیرونی بخارا میں رہتے تھے۔ پھر چنگیز خاں کے لشکر نے اس تہذیب کو روندا۔ امیر تیمور نے یہاں ایک عظیم

الشان سلطنت قائم کی جس کی سرحدیں ایشیاء سے نکل کر یورپ تک چلی گئی تھیں۔ تیمور اور اس کے جانشینوں بالخصوص اس کے پوتے الغ بیگ کے عہد حکومت میں سمرقند اور بخارا کا شمار دنیا کے عظیم شہروں میں ہونے لگا۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر بھی یہیں سے آیا تھا۔ ازبکستان کا چپہ چپہ ماضی کی تاریخ کا امین ہے۔

ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو تاشقند کا موسم دہلی کی طرح ہی لگا۔ ازبکستان ہوٹل جس میں ہمارا قیام ہے، انقلاب چوک میں واقع ہے، بیحد خوبصورت جگہ ہے۔ سامنے ہی ازبکستان کے ادیبوں کی انجمن کا دفتر ہے۔ ہم نے لینن چوک بھی دیکھا جہاں ازبکستان کی سپریم سوویت کی عمارت واقع ہے۔ بہت پر فضا مقام ہے۔ چاروں طرف خوبصورت باغ ہیں، فوارے الگ چل رہے ہیں۔ اس شہر کی زیادہ تر عمارتیں اپریل ۱۹۶۶ء میں تاشقند کے زلزلے کے بعد بنی ہیں۔ لینن کا ایک بھاری مجسمہ بیچوں بیچ نصب ہے۔ ازبک ادب کے بانی علی شیر نوائی کے نام پر یہاں جو شاہراہ ہے وہ تاشقند کی سب سے بڑی شاہراہ ہے۔ دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔ تاشقند کے ایک پارک میں ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا ایک خوبصورت مجسمہ بھی نصب ہے۔ آنجہانی شاستری نے جنوری ۱۹۶۶ء میں اس وقت کے صدر پاکستان ایوب خاں کے ساتھ تاشقند معاہدہ پر دستخط کئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔

قوموں کی دوستی کا چوک اور محل دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہیں ایک لوہار اور اس کی بیوی اور ان کے گود لئے ہوئے چودہ بچوں کا مجسمہ ہے جسے دیکھ کر انسان دوستی اور عالمی امن پر آدمی کا یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ اس مجسمہ کا قصہ یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب سارے سوویت یونین میں یتیم یسیر اور بے سہارا بچوں کی تعداد بڑھ گئی تھی تو تاشقند کے ایک لوہار احمد شاہ محمود وف اور اس کی بیوی نے مختلف قومیتوں کے چودہ یتیم بچوں کو گود لے لیا تھا اور انہیں وہ پیار اور تربیت دی تھی جو شاید ان کے اصلی ماں باپ بھی نہ دے سکتے تھے۔ احمد شاہ محمود وف تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں البتہ ہمیں بتایا گیا کہ ان کی بیوی ابھی تک زندہ ہیں اور یہ چودہ بچے جو اب بڑے ہو

چکے ہیں سوویت یونین کے مختلف علاقوں میں رہتے ہیں۔ان میں کچھ مر چکے ہیں۔جو زندہ ہیں وہ اپنی ماں سے ملنے اکثر تاشقند آتے رہتے ہیں۔ایسا پر شکوہ اور اثر انگیز مجسمہ ہے کہ جسیلگا تار دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔

تاشقند کی عالیشان عمارتوں اور وسیع وعریض سڑکوں کو دیکھ چکے تو ہم نے غفور جہاں گستری سے کہا" جناب والا آپ کے ہاں کوئی پرانا تاشقند بھی ہوگا اسے دکھائیے۔" اور تھوڑی دیر بعد ہم پرانے تاشقند میں تھے۔ازبک ٹوپیاں اور پگڑیاں باندھے ہوئے لوگ سڑکوں سے گذر رہے تھے۔تنگ گلیاں، ان گلیوں میں بہتی ہوئی موریاں، سر راہ کباب اور پھل بیچنے والے، قہوہ پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف لوگ۔ان سب کو دیکھ کر ہمیں یوں لگا جیسے ہم پرانی دہلی کے کسی علاقے سے گذر رہے ہیں۔گلیوں کے دونوں طرف یک منزلہ عمارتیں ہیں۔باہر سے اکثر بوسیدہ نظر آتی ہیں۔مگر سنا ہے کہ اندر سے سجی سجائی ہیں۔شہر کے اس حصہ میں سب سے اونچی عمارت مسجد سکہ شیخ کا مینار ہے۔ یہ محلہ سوویت مشرق کا اسلامی مرکز ہے اور یہاں وسط ایشیاء اور قزاقستان کے مسلمانوں کا ادارہ دینیات واقع ہے۔اس ادارہ کے سربراہ مفتی شمس الدین ابن ضیاء الدین ذیشان اس دن باکو گئے ہوئے تھے جہاں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔اس ادارہ کے برابر ہی تاشقند کے مشہور عالم اور مفتی امام کفال شاشی کا مقبرہ ہے۔مفتی کفال شاشی نے ایک طویل عرصہ بغداد میں گذارا تھا۔جب وہ تاشقند واپس ہونے لگے تو بغداد کے اس وقت کے خلیفہ نے ان کی علمی ودینی خدمات سے متاثر ہو کر انہیں قرآن کا وہ نسخہ تحفہ میں دیا تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک صفحہ پر جو دھبے ہیں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے ہیں۔ یہ نسخہ بعد میں پیٹرس برگ چلا گیا۔اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد لینن کے دستخط شدہ فرمان کے مطابق قرآن پاک کا یہ نسخہ سوویت مشرق کے مسلمانوں کے حوالہ کر دیا گیا اور آج بھی یہاں محفوظ ہے۔

تاشقند کا ادارہ دینیات سوویت یونین کے مسلمانوں کے چار مذہبی مرکزوں میں سے ایک ہے۔ یہ ادارہ سوویت مشرق کی پانچ جمہوریتوں قزاقستان، ازبکستان، تاجکستان، کرغزیہ اور ترکمانیہ کی

مسجدوں اور مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کو متحد کرتا ہے۔اس ادارہ کے تحت دینی تعلیم کا انتظام موجود ہے۔اس کے کتب خانے میں تیس ہزار دینی کتابیں ہیں جن میں سے اکثر نایاب ہیں۔ادارہ دینیات اور مسجدوں کے لئے مالی وسائل دینداروں کے عطیوں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ تاشقند کے زلزلے سے متاثر ہونے والے خاندانوں کی امداد کے لئے ادارہ دینیات نے دو لاکھ روبل (موجودہ شرح مبادلہ کے مطابق ایک روبل سولہ ہندوستانی روپئے کے برابر ہوتا ہے) عطیہ اپنے فنڈ سے دیا تھا۔اسی ادارے نے قرآن شریف کے کئی ایڈیشن شائع کئے ہیں۔وہ ہر سال قمری جنتری اور دیگر مذہبی رسالے شائع کرتا ہے۔

ہم جب اس ادارے میں گئے تو دوپہر کا وقت تھا اور دن اتوار کا تھا۔مسجد کا صحن کافی بڑا ہے۔ پتہ چلا کہ جمعہ کی نماز کے وقت صحن نمازیوں سے بھر جاتا ہے۔مسجد کے ایک حصہ کی تعمیر زور وشور سے جاری تھی۔لیکن ہمیں سب سے زیادہ دلچسپی ان نوجوان جوڑوں سے تھی جو عروسی لباس پہنے جوق در جوق ادارے میں آرہے تھے۔پتہ چلا کہ یہ جوڑے اسلامی طریقے سے نکاح پڑھوانے آرہے ہیں۔سوویت قانون کے مطابق ہر شادی کا رجسٹریشن ضروری ہوتا ہے۔اس کے بعد کوئی چاہے تو مذہبی طریقے سے بھی شادی رچا سکتا ہے۔چونکہ اتوار کو چھٹی کا دن ہوتا ہے اسی لئے نوجوان جوڑے اس دن ادارہ دینیات میں آتے ہیں۔نوجوان جوڑے زرق برق لباس پہنے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ موٹروں میں لدے پھندے آرہے تھے۔مسجد میں ایک میلہ کا سا گمان ہو رہا تھا۔السلام علیکم، وعلیکم السلام اور مرحمت (شکریہ) کے الفاظ بار بار سنائی دیتے۔ہم نے بعض جوڑوں کو مبارک باد دی۔دلہنیں ہماری مبارک باد سے بہت خوش ہو رہی تھیں اور ''مرحمت، مرحمت'' کی رٹ لگا دیتی تھیں۔ایک دلہن کا نام پوچھا تو اس کا نام مشکورہ نکلا۔دوسری سے پوچھا تو وہ ماہرہ نکلی۔تیسری جوڑی تو عائشہ تھی۔مشکورہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر ہم سے ازبک میں پوچھا ''پردیسی یہ تو بتاؤ میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' ہمارے مترجم تھے غفور جہاں گستری۔ہم نے کہا ''بی بی! آپ کے دولہا میاں آپ کے ساتھ ہیں اسی لئے ہم سے صحیح جواب کی توقع نہ رکھو۔یہ تمہارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم بتاتے کہ تم کیسی لگ رہی ہو۔کیا تم سچ مچ اس دنیا کی مخلوق

ہو؟" غفور جہاں گستری نے ہماری اردو کا نہ جانے کیا ترجمہ کیا کہ اب کی بار دولہا میاں ہمارے سر ہو گئے کہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ ہم نے سوچا کہ غفور صاحب نے ضرور ترجمہ کا گھپلا کیا ہے ورنہ جہاں ہمیں رسوائی ملنی چاہیے تھی وہاں ہمارے حصہ میں نیک نامی کیسے آ گئی۔ کھانے کے معاملے میں غفور صاحب کی نیت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ کہنے لگے کہ آپ شادی کی دعوت میں چلیں تو آپ کو از بک کھانوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی مل جائے گا۔ مگر ہم نے دولہا میاں سے معذرت کی کہ بھیا! ایک لکھنوی دوست منظر سلیم تاشقند میں رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ رات کے کھانے کی بات پہلے سے طے ہو چکی ہے۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ آپ کی دعوت میں شرکت کریں، ایسی محبت ہمیں پھر کہاں ملے گی۔ مگر پھر وہی منظر سلیم ہائے منظر سلیم! تم ہندوستان میں کبھی نہیں ملے۔ اب تاشقند میں ملے بھی تو کب ملے۔ بادل نخواستہ نوجوان جوڑوں سے اجازت لے کر مشہور عالم مدرسہ کوکلتاش اور برق خاں کے مدرسہ کو دیکھنے گئے۔ یہ دونوں مدرسے سولہویں صدی عیسوی میں شیبانی خاں کے دور حکومت میں بنے تھے۔ ان مدرسوں کو جس طرح محفوظ رکھا گیا ہے انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ عمارتیں ابھی ابھی بنی ہیں۔

• • •

ہم نے اردو میں ازبیک کھانا کھایا

ہم جب بھی بیرونی سفر پر جاتے ہیں تو کم از کم پیٹ کی بھوک کے معاملے میں یہ احتیاط ضرور کرتے ہیں کہ بھوک اُسی وقت لگے جب ہمارا یا ہماری مترجم ہمارے ساتھ ہوں۔ اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھنے کی صورت میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ ہم نے انڈا کھانا چاہا اور بیرے نے سالم مرغ ہمارے سامنے لاکر رکھ دیا۔ مرغ اور انڈے کا تو خیر ایک رسمی اور غیر رسمی سا رشتہ بھی ہے۔ پیرس میں ہم نے اشاروں کی مدد سے آئسکریم کھانی چاہی تھی اور بیرے نے ان اشاروں کا سلیس ترجمہ سور کے گوشت کے قتلوں کی شکل میں لاکر رکھ دیا تھا۔ کھانے کے معاملے میں اتنی جدیدیت کے ہم قائل نہیں ہیں۔ بیرونی سفر کے اس وسیع تجربہ کی روشنی میں ہم نے ازبکستان میں حتی الامکان یہ کوشش کی کہ مترجم کی غیر موجودگی میں ہمیں بھوک نہ لگنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ مترجم کی موجودگی میں ہم کھانے کے سوائے کوئی اور کام ہی نہیں کرتے۔ اسے ہمارا جذبہ حب الوطنی نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ وطن عزیز میں ہمیں بڑی مشکل سے بھوک لگتی ہے مگر جیسے ہی وطن سے باہر قدم نکالتے ہیں بھوک کچھ اس زور سے چمکتی ہے کہ بجلی بھی کیا چمکے گی۔ ہم نے ازبیک میزبانوں سے کہہ رکھا ہے کہ ہندوستان میں ہمارا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے ہے اور یہ کہ ہمارے معدہ کو مرغن غذاؤں سے خاص رغبت ہے اور سیدھی سادی غذاؤں سے ہمارا ہاضمہ خراب ہوجاتا ہے۔ ہم تو ناشتے میں ہی اتنا کھا جاتے ہیں کہ وطن عزیز میں پورے دن بھر میں اتنا کھانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس پر مستزاد دوپہر کا کھانا، شام کا ناشتہ اور رات کا کھانا الگ کھا جاتے ہیں جو وطن میں ہماری ایک ہفتہ کی غذا کے برابر ہوجاتا ہے۔ کھانے کے معاملہ میں اتنی احتیاط کے باوجود ایک سہ پہر کو اچانک بھوک نے زور مارا۔ ہم نے اپنے مترجم کو کہہ رکھا تھا کہ وہ ہمیں گھنٹہ بھر آرام کرنے کا

موقع عنایت کریں۔ وہ جا چکے تو بھوک آ گئی۔ بھوک کے ہم کچے تو ہیں ہی، اکیلے ہی ہوٹل ازبکستان کے ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ بیرے کو بلا کر اپنے دانتوں میں دو انگلیاں ڈالیں اور لگے چبانے۔ بیرا بہت ہوشیار تھا۔ ہمارے اشارے کو بھانپ کر ازبیک میں پوچھا "کوشت؟"

ہم نے اردو میں کہا "ہاں ہاں کوشت۔" پھر اپنے ہاتھوں سے پیالے کی ایک شکل بنائی اور ہاتھ کو ہلا ہلا کر اس میں لہریں سی چلانے لگے۔ ہمارے اس اردو اشارے کا مطلب یہ تھا کہ پیالے میں کوشت کا شوربہ لے آؤ۔ بیرے نے ازبیک میں پوچھا "پیالہ؟"

ہم نے اردو میں کہا "ہاں ہاں پیالہ۔" پھر پیالے میں چلنے والے ہمارے ہاتھ کی لہروں کے اشارے کو تاڑ کر بیرے نے ازبیک میں پوچھا "شوربا؟"

ہم نے کہا "ہاں ہاں شوربا۔ اگرچہ ہم اردو میں ایک نقطہ والا شوربا پیتے ہیں لیکن ازبکستان میں تین نقطوں والا شوربا پینے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ایک نقطہ والا شوربا ہی جب اتنا لذیذ ہوتا ہے تو تین نقطوں والا شوربا تو اور بھی لذیذ ہوگا۔"

ہم نے ہاتھ کی روٹی بنائی تو بیرے نے ازبیک میں پوچھا "نان؟"

ہم نے اردو میں کہا "ہاں ہاں بھئی نان! تم تو اُردو بہت اچھی جانتے ہو"۔ اس نے سمجھا کہ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ اب ہم اسے کس طرح سمجھاتے کہ ہم تو اردو کو نہیں کھاتے۔ البتہ ہمارے ملک میں اردو اکیڈیمیاں ہیں جو اردو کو ضرور کھا رہی ہیں۔ پھر ہم نے ہاتھ کے اشارے سے چمچہ بھی لانے کو کہا تو بیرے نے ازبیک میں پوچھا "چمچ؟"

ہم نے اردو میں کہا "ہاں ہاں چمچ برخوردار تم تو اردو جانتے ہو۔ پہلے بتایا ہوتا تو ہمیں اداکاری کے اتنے جوہر دکھانے کیوں پڑتے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے ہاں چمچہ صرف دسترخوان پر چلتا ہے یا سیاست اور حکومت کے ایوانوں میں بھی چلتا ہے؟ بیرے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ظاہر ہے کہ چمچوں کے فوائد اور نقصانات سے جتنا ہم واقف ہیں ازبکستان والے کہاں سے واقف ہوں گے۔ جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہر اردو کھانے کا نام ازبکستان میں وہی ہے تو بیرے

سے پوچھ لیا "میاں! یہ تو بتاؤ تمہارے پاس کھانے کے لئے اور کیا ہے؟"

اس پر بیرا ازبیک میں کہنے لگا "پلاؤ ہے، کباب ہے، قورمہ ہے، قیمہ ہے، تنجن ہے، ماش کھچڑی (ماش کی دال کی کھچڑی) ہے۔"

یہ سن کر جی ہی جی میں غصہ آیا کہ ازبکستان کے لوگوں نے ہمارے اتنے اچھے اور لذیذ کھانوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔

بعد میں غفور جہاں گستری سے ازبیکوں کی اس دست درازی کا شکوہ کیا تو وہ نظریں جھکا کر خاموش ہو گئے۔ لیکن جب خود ٹھنڈے دماغ سے غور کیا تو احساس ہوا کہ یہ تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والا معاملہ ہے۔ یہ پکوان تو ہیں ہی وسط ایشیاء کے۔ جنہیں مغل اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے تھے اور ان کی مدد سے آج تک ہم اپنا وزن اور بلڈ پریشر دونوں کو بڑھا رہے ہیں۔ ازبکستان میں چار روزہ قیام کے دوران میں ہمیں ایسے کئی لفظ ملے جو اردو اور ازبکستانی دونوں میں مشترک ہیں۔ جیسے دسترخوان، مہمان خانہ، آپا، خالہ، کتاب، کاغذ، قلم، دیوان، مشاعرہ، شاعر، غزل وغیرہ۔

ایک بات اور ہم نے یہ محسوس کی کہ ازبکستان کے قول اور فعل میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔ "ح" اور "خ" دونوں حروف تہجی کی آوازیں ان کی زبان میں رائج ہیں۔ لیکن جہاں "ح" کی آواز نکالنی ہوتی ہے وہاں وہ اسے "خ" کے تلفظ سے ادا کرتے ہیں اور جہاں "خ" بولنا ہوتا ہے وہاں "ح" بولتے ہیں۔ "محمد" کو "محمد" بولیں گے۔ بخارا شریف کو "بحارا شریف"، "مہمان خانہ" کو "مہمان حانہ" بولیں گے۔ ان کا ایک خوبصورت شہر ہے جسے وہ "شحری سبز" بولتے ہیں۔ ہم بھی "شحری سبز" "شحری سبز" کی گردان کرتے رہے۔ ایک دن ازبکستان کے بارے میں ایک انگریزی کتاب مل گئی تو اس "شحری سبز" کے آگے اس کا انگریزی ترجمہ Green City لکھا ہوا پایا۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ یہ تو اصل میں "شہر سبز" ہے۔ ایک دن غفور جہاں گستری نے ہمیں بتایا کہ ہمیں تاشقند کے انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ بھی چلنا ہے۔ ہم نے پوچھا "یہاں

کیا ہے؟" بولے "یہاں بہت قدیم مخطوطات ہیں۔شرقیات کے بارے میں یہاں تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ بہت مشہور ادارہ ہے۔آپ کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو، دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور تیسری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی بھی یہاں آچکی ہیں۔" ہم نے کہا مخطوطات تو خیر ہمارے گھر میں بھی بہت ہیں۔خود ہمارے کئی نا قابل اشاعت مضامین مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں مگر ہم اورینٹل انسٹی ٹیوٹ ضرور جائیں گے کیونکہ ہم کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے۔"

تاشقند کا اورینٹل انسٹی ٹیوٹ بڑی عالیشان عمارت میں واقع ہے۔ہم وہاں پہنچے تو انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خیر اللہ مظفر اپنے رفقاء کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔صباحت عظیم جانو! بھی تھیں جو ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے بارے میں تحقیق کر رہی ہیں۔ڈاکٹر عارنوف تھے جو جدید اردو ادب پر کام کر رہے ہیں۔ڈاکٹر سوتلیانہ تھیں جو جدید ہندی ادب پر کام کر رہی ہیں۔ڈاکٹر ہاشموف الیاس تھے جنہوں نے ٹیگور پر خاصا کام کیا ہے۔اور بھی کئی محققین وہاں موجود تھے جن کے بارے میں ہم نے مزید تحقیق اس لئے نہیں کی کہ تحقیق ہمارا میدان نہیں ہے۔ڈاکٹر خیر اللہ نے نہایت تفصیل کے ساتھ ہمیں اس انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں بتایا۔ افغانستان اور عرب ممالک کے کئی محققین یہاں تحقیق کی غرض سے آتے ہیں۔ہندوستان کے مغل حکمرانوں پر تحقیق کے نتیجہ میں وسط ایشیاء کی تاریخ کے کئی گوشے نمایاں ہوئے ہیں۔ مسودات اور مخطوطات کے نگراں ڈاکٹر منیروف نے ہمیں ان مخطوطات کا دیدار بھی کرایا جنہیں دیکھ کر ہماری آنکھیں وہ ہو گئیں جو اکثر ہو جاتی ہیں یعنی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔نویں صدی عیسوی میں خط کوفی میں لکھا ہوا قرآن مجید کا نسخہ بھی دیکھا۔کلیات امیر خسرو کا سب سے قدیم نسخہ اسی انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے۔حافظ شیرازیؒ نے عقیدت کے طور پر حضرت امیر خسروؒ کے کچھ کلام کو اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا۔یہ نسخہ بھی حافظؒ کے دستخط کے ساتھ یہاں محفوظ ہے۔اس کا دیدار کر کے ہم نے اپنے دل کو سرور اور نظر کو نور عطا کیا۔ ۱۱۶ تصویروں والے مصور شاہنامہ فردوسی کے بھی درشن کئے۔البیرونی، عمر خیام، رازی، علی شیر نوائی اور کئی اہل قلم کے قلمی نسخے دیکھنے کو ملے۔

اس ادارہ میں اٹھارہ ہزار سے زائد قلمی نسخے ہیں۔ قلمی نسخوں کے نگران ڈاکٹر منیر وف اپنے میدان کے ماہر ہیں۔ یہ ادارہ پہلے علی شیر نوائی لائبریری کا حصہ تھا۔ ۱۹۴۳ء میں سائنس اکیڈیمی کے زیر اہتمام اس ادارہ کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اس ادارہ میں کئی ریسرچ اسکالر اسلام کی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ ایک اسکالر سرگئے مرتینوف بھی ملے جو چین میں اسلام کے موضوع پر ان دنوں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ اس ادارہ کا تفصیلی معائنہ ابھی جاری ہی تھا کہ ہم نے ڈاکٹر منیر وف سے کہا کہ آپ کے ادارہ کی کتاب الرائے ہمیں چاہئے، ہم اپنی رائے قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔ غفور جہاں گستری بولے "ابھی تو اور بھی کئی مخطوطات ہیں۔ جب آپ سب کچھ دیکھ لیں تو آپ کی رائے بھی بنے گی۔ تب لکھ دیجئے۔" ہم نے کہا ہماری رائے بن چکی ہے۔ یوں بھی رائے دینے کے معاملے میں اپنے ملک میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو کئی ادیبوں کی کتابوں میں شامل ہمارے مقدمے پڑھ لیجئے یا ان کتابوں کے فلیپ دیکھ لیجئے۔ آپ کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں تو ہم کافی تفصیلی معائنہ کے بعد رائے دے رہے ہیں۔ کتابوں کے بارے میں تو انہیں پڑھے بغیر ہی رائے دے دیتے ہیں۔ اصل میں ہم تحقیق اور مخطوطات کے آدمی ہی نہیں ہیں۔ اس لئے رائے دینے کے لئے بے چین ہیں۔ ہم نے عجلت میں کتاب الرائے میں اپنی گرانقدر رائے لکھی۔ ڈاکٹر خیر اللہ مظفر اور ڈاکٹر منیر وف کی درازی عمر کے لئے دعا کی اور چلے از بیک ہندوستانی دوستی انجمن میں اپنا خیر مقدم کروانے۔ اور اس خیر مقدمی تقریب میں ہمیں جانے کی جلدی اس لئے بھی تھی کہ ہمیں سورت میر قاسموف کی اردو سننی تھی۔ سورت میر قاسموف ابھی ایک سال پہلے تک ہندوستان میں روسی سفارت گھر میں ثقافتی شعبہ کے نائب مہتمم تھے۔ ان دنوں تاشقند میں از بیک رہندوستانی دوستی انجمن کے نائب صدر ہیں۔ سچ پوچھئے تو ازبکستان میں ہم اسی انجمن کے مہمان تھے۔ اردو کے بہت بڑے اسکالر ہیں۔ لکھنؤ کے لہجہ والی اردو بولتے ہیں۔ بہت محبت سے ملے۔ ان دنوں تاشقند میں خواتین کی کوئی بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کے انتظامات میں بہت مصروف تھے۔ پھر بھی وقت نکال کر ہم سے ملنے آئے۔ غفور جہاں گستری سے ہم نے میر قاسموف کے بارے میں پوچھا تو

بولے ''از بیک رہند دوستی کی انجمن کے خیر مقدمی جلسے میں ان سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔'' میر قاسموف سے ہماری یاد اللہ دہلی میں ان کے قیام کے زمانے سے ہے۔ جب بھی اردو کے مستقبل سے مایوس ہو جاتے تھے تو ان کی اردو سننے کے لئے چلے جاتے تھے۔ اب بھلا تاشقند میں ان سے کیسے نہ ملتے۔ از بیک رہند دوستی انجمن کے دفتر گئے تو میر قاسموف اپنی خوبصورت اور دلنشین اردو کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ پہلے اپنے دفتر کا معائنہ کرایا۔ معلوم ہوا کہ دوستی انجمن کے ۱۲۰ ممالک سے تعلقات ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہی ہند راز بیک دوستی کا مہینہ منایا گیا تھا جس کے تحت سارے از بکستان میں ہندوستانی فلمیں دکھائی گئیں۔ میر قاسموف نے بتایا کہ از بکستان میں پچاس سے زیادہ ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ خیر مقدمی تقریب میں تاشقند یونیورسٹی کے کئی طلباء بھی موجود تھے جو اردو سیکھ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ سارے از بکستان میں اردو کے چار اسکول ہیں اور ہر اسکول میں کم از کم چار سو طلباء اردو سیکھ رہے ہیں۔ سارے سوویت یونین میں سہ لسانی فارمولہ رائج ہے جس کے تحت طالب علم کو پہلے تو اپنے علاقہ یا ریاست کی زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ دوسری لازمی زبان روسی ہوتی ہے۔ تیسری زبان کے طور پر طالب علم کو کوئی بھی بیرونی زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ اس کے تحت اکثر طالب علم اردو سیکھتے ہیں۔ اس محفل میں اردو کے کئی طلبا و طالبات جیسے حسن ترویف، رحیمو اگل یورا، مجید عبدالرحمانوا وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ شرف مرزائف بھی ملے جو تاشقند کے ادبی اشاعت گھر ''رادوگا'' میں اردو کے ایڈیٹر ہیں۔ بہت سلیس اور شستہ اردو بولتے ہیں۔ ریڈیو تاشقند میں اردو کے انچارج امین جان رستموف بھی ملے جنہوں نے بعد میں ریڈیو تاشقند کے لئے اردو میں ہمارا انٹرویو بھی لیا۔

میر قاسموف نے اپنی دل نشین اردو میں ایک مؤثر تقریر بھی کی۔ ہمیں یاد ہے کہ پچھلے سال میر قاسموف جب تبادلہ کے بعد دہلی سے سوویت یونین واپس جا رہے تھے تو ان کی وداعی تقریب میں ہم شرکت کے لئے خاص طور پر گئے تھے تاکہ آخری بار ان کی فصیح و بلیغ اردو کو سن سکیں۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ایک سال بعد ہمیں تاشقند میں ان کی اردو کو پھر سے سننے کا موقع ملے گا۔ میر قاسموف بہت ٹوٹ کر ملے۔ آخر میں دوستی انجمن کی طرف سے ہمیں تحفے بھی دیئے گئے اور ایک از بیک

ٹوپی بھی ہمیں پہنائی گئی۔اس چوکوشیہ از بیک ٹوپی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ سارے سر پر نہیں سماتی بلکہ سر کے سب سے اوپری حصہ پر ٹکی رہتی ہے۔سارے ازبیکی اس ٹوپی کو اپنے سروں پر ٹکائے گھومتے رہتے ہیں۔ہم نے بھی سر پر ازبیکی ٹوپی لگائی اور دل میں دعا کی کہ زندگی میں پھر کبھی میر قاسموف کی اردو کو سننے کا موقع ملے۔

● ● ●

ازبکستان کے ادیبوں کے درمیان

خوشحالی، خوشحالی، خوشحالی۔ ازبکستان میں لگاتار چار دنوں تک اتنی خوشحالی دیکھی کہ جی اوب سا گیا۔ اتنی خوشحالی ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ بڑی بڑی عمارتوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں دیکھنے کو نہ ملیں تو ہمیں ہر شئے میں کسی شئے کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ غربت کی نراوائی کو تو ہم ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں بلکہ اس غرض سے مشرق کے دانشوروں نے قناعت، صبر اور توکل پر عمل کرنے اور غریبی میں نام پیدا کرنے کی اتنی تلقین کر رکھی ہے کہ خوشحالی ذرا سی بڑھ جائے تو ہمارے کردار مشکوک نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ازبکستان کی خوشحالی کو برداشت کرتے ہوئے دو ایک بار ہمیں شبہ ہوا کہ ہمارے کردار کے پاؤں لڑکھڑانے لگے ہیں۔ ایسے موقعوں کے لئے بزرگوں نے تزکیہ نفس کے کئی ٹوٹکے ایجاد کر رکھے ہیں۔ بلکہ ہم نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پورے ایک دن کا برت رکھیں گے اور لیموں کا پانی پی کر گذارا کر لیں گے تاکہ ہمارے کردار کو استحکام اور استقامت عطا ہو۔ ایسی باتوں کے بغیر ہمارا کردار مضبوط ہی نہیں رہتا۔ ہم اپنے ارادے پر عمل کرنا ہی چاہتے تھے کہ ہمیں یہ مژدہ جانفزا سنایا گیا کہ ازبکستان کے ادیب اور شاعر ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم نے سوچا اب لیموں کا پانی پی کر گذارا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیونکہ ادیبوں اور شاعروں کی مخلوق ایسی ہوتی ہے جسے خوشحالی سے یوں بھی خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ اردو کے ادیب ہونے کے ناتے ہمارا تو تجربہ یہی رہا کہ بھوکے پیٹ ہم جتنا اچھا لکھ لیتے ہیں اتنا شکم سیری کے بعد نہیں لکھ سکتے۔ اگر کوئی شاعر صاف ستھرا اور قیمتی لباس پہن کر کسی مشاعرہ میں کلام سنائے تو اس کے کلام میں معنی تلاش کرنے میں ہم جیسوں کو بہت دشواری پیش آتی ہے۔ شاعر کے پھٹے پرانے، میلے کچیلے کپڑے، اس کی دگرگوں حالت اور بڑھے ہوئے بال ہی اس کی شاعری میں مفہوم پیدا کرنے کی ضمانت ہوتے ہیں۔

اس ذہنی پس منظر کے ساتھ ہم ازبکستان کے ادیبوں کی پس ماندگی کو دیکھنے کی آس میں خوشی خوشی رائٹرس یونین کے دفتر گئے تو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ رائٹرس یونین کا دفتر ادیبوں اور شاعروں کا دفتر نہیں لگتا بلکہ اسٹاک ایکسچینج کا دفتر لگتا ہے۔ نہایت عالیشان عمارت ہے۔ ایسی عمارت میں اگر دو دن بھی ہمیں رہنے کا موقع ملے تو ہمارا سارا ادب خطرے میں پڑ جائے۔

رائٹرس یونین کے نائب صدر اسد مختار جو بیک وقت ناول نگار، شاعر اور افسانہ نگار ہیں ایک بھاری بھرکم ''السلام علیکم'' کے ساتھ ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ہم نے پوچھا آپ کے صدر صاحب، استقبال کے لئے کیوں نہیں آئے۔ پتہ چلا کہ رائٹرس یونین کے صدر عمر بیک ہماری ہی طرح ادیبوں کے کسی وفد کے ساتھ کوریا گئے ہوئے ہیں۔ اسد مختار ساٹھ کے پیٹے میں ہوں گے۔ ان کے بیک وقت ناول نگار، شاعر اور افسانہ نگار ہونے پر ہمیں اردو کے ایک ادیب یاد آ گئے جو بیک وقت تین چار اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مشاعرہ میں ہوٹنگ ہوتی ہے تو افسانہ لکھتے ہیں۔ افسانہ کو قارئین ناپسند کرتے ہیں تو تنقید لکھتے ہیں۔ ان کی تنقید پر لوگ تنقید کرتے ہیں تو پھر سے مشاعرہ میں نظر آتے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے ان کا حال کچھ اس طرح کا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہم نے سوچا کہ اسد مختار صاحب بھی غالباً ''ضرورت ادبی'' کے تحت بیک وقت ناول نگار، شاعر اور افسانہ نگار بنے ہوئے ہیں۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ ازبکستان کے مشہور ادیبوں میں سے ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے، ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بہت تپاک سے ملے۔ قبل اس کے کہ وہ ازبکستان کے ادیبوں کی انجمن کے بارے میں کچھ بتاتے ہم نے انہیں مختصر طور پر بتایا کہ انجمن سازی سے ہمارا بھی بہت پرانا رشتہ ہے اور یہ کہ ایک زمانہ میں ادب کم تخلیق کرتے اور ادیبوں کی انجمنیں زیادہ بناتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ادب کے ایوان میں انجمن کے راستے سے ہی داخل ہوئے ہیں۔ آج بھی دو چار انجمنیں ہماری جیب میں اور ان

کے لیٹر پیڈ ہمارے بریف کیس میں پڑے رہتے ہیں۔ کسی انجمن میں ہم صدر ہیں، کہیں نائب صدر ہیں، کہیں سرپرست ہیں اور کہیں جنرل سکریٹری ہیں۔ خازن کو چھوڑ کر ہم ہر عہدہ پر براجمان رہے ہیں۔ ایک بار ایک انجمن میں خازن بھی رہے۔ لیکن جب حاسدوں اور دشمنوں نے ہم پر پورے پانچ روپیوں کی خطیر رقم کے غبن کا الزام عائد کیا تو ہم انجمن سے علیحدہ ہو گئے۔ بفضل تعالیٰ آج ہم اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں۔ ہم نے اسد مختار کو بتایا کہ انجمن سازی اور انجمن بانی کے اس وسیع تجربہ کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ ایک پنسری میں مینڈکوں کو پکڑنا۔ ایک کو پکڑ کر پنسری میں رکھو تو دوسرا پنسری سے باہر کود جاتا ہے۔ آپ کے ادیبوں نے بھی مینڈکوں سے ضرور کچھ نہ کچھ سیکھا ہوگا۔ اسد مختار بولے "ہماری انجمن میں کسی کو کودنے پھاندنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ادب تخلیق کرنے والوں کو مینڈکوں سے کیا لینا دینا۔" پتہ چلا کہ ازبکستان کے ادیبوں کی انجمن کے ارکان کی تعداد چھ سو ہے جن میں سے ۲۰۰ تو خود تاشقند شہر میں رہتے ہیں۔ باقی ارکان اضلاع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضلعوں میں بھی انجمن کی شاخیں ہیں۔ انجمن کی طرف سے پانچ رسالے شائع کئے جاتے ہیں۔ "ازبکستان ادبیات" انجمن کا ہفتہ وار اخبار ہے جو ادیبوں کی تخلیقات شائع کرنے کے علاوہ ان کی سرگرمیوں کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ انجمن کی دس کونسلیں ہیں جو اشاعت کے لئے کتابوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ سارے اشاعت گھر ریاستی ہیں جن میں "غفور غلام اشاعت گھر" اور "محنت اشاعت گھر" بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ازبکستان میں سال بھر میں اوسطاً ۶۰۰ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ جن میں سے ۲۴ فی صد کتابیں دوسری جمہوریتوں کے ادیبوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ انجمن کے جلسوں میں ادیبوں کی تخلیقات پر غور و خوض کیا جاتا ہے اور ادب کے نئے رجحانات پر بحث کی جاتی ہے۔ جب ادیب ۶۰ سال کا ہو جاتا ہے تو حکومت اس کی ادبی خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے لئے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیتی ہے۔ وظیفے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ریاستی حکومت کے وظیفہ کی رقم عموماً ۱۲۰ روبل ہوتی ہے۔ مرکزی حکومت کا وظیفہ ۱۵۰ روبل کا ہوتا ہے۔ ضلع کے انتظامیہ کی طرف

سے دیا جانے والا وظیفہ ۹۰ روبل کا ہوتا ہے۔ گویا ۶۰ سال کے بعد ازبکستان کا کوئی ادیب اگر چاہے تو آرام اور سکون کی زندگی گذار سکتا ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ شاعر ۸۰ برس کا ہو گیا ہے اور مشاعرہ میں چار لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر جا رہا ہے اور مشاعرہ میں کلام سنا رہا ہے۔ انجمن کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ اس دن رائیٹرس یونین کے جلسہ میں یوں تو بہت سے ادیب تھے، محمد علی تھے جنہوں نے رامائن کا ازبکی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جمعہ نیاز جباروف تھے جو ازبکستان کے مشہور شاعر ہیں اور ادبی تراجم کے سربراہ بھی ہیں۔ مگر ہمیں سب سے زیادہ خوشی نعمت امینوف نشتر سے مل کر ہوئی جو ازبکستان کے طنز و مزاح نگار ہیں۔ انہیں جب پتہ چلا کہ ہم بھی طنز و مزاح نگار ہیں تو بہت ٹوٹ کر ملے۔ ہم نے نعمت امینوف سے پوچھا "کیوں بھئی نعمت صاحب! آپ کے ہاں طنز و مزاح کا کیا حال ہے؟ کیا آپ لوگ واقعی ہنستے ہیں اور اگر ہنستے ہیں تو کس طرح ہنستے ہیں اور کس پر ہنستے ہیں؟"

نعمت امینوف نے کہا "جناب والا پتہ نہیں باہر یہ کیوں مشہور ہے کہ سوویت معاشرہ میں ہنسی مذاق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم جتنا ہنستے ہیں، اتنا شاید کوئی ہنس سکے۔ ہمارے ہاں طنز و مزاح کی روایت بہت مستحکم ہے۔ ملا نصیر الدین ازبکستان کے ہی رہنے والے تھے، جن کے لطیفے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ہمارے ہاں طنز و مزاح کا ایک باضابطہ رسالہ "مشتم" کے نام سے ۱۹۲۲ء سے نکلتا ہے جس کی تعداد اشاعت ۶ لاکھ ہے۔ اس کے علاوہ ہر ادبی رسالہ میں طنز و مزاح کا ایک الگ گوشہ ہوتا ہے۔ نعمت امینوف نے ہمیں "مشتم" کے کچھ شمارے بھی دیئے۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت رسالہ ہے۔ کیا چھپائی ہے۔ کیا عمدہ کارٹون ہیں۔ نعمت امینوف نے ہماری ذات میں اور ہم نے ان کی ذات میں اتنی دلچسپی لی کہ اسد مختار کو یہ کہنا پڑا "مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے دو بچھڑے ہوئے بھائی مدتوں بعد آپس میں مل رہے ہوں۔"

نعمت امینوف نے اس دن ایک دلچسپ لطیفہ بھی سنایا کہ ایک ازبکی اپنے چھوٹے بچے کو لے کر بخارا کی سیر کرنے گیا۔ بخارا کے مشہور کلاں مینار کے قریب یہ دونوں پہنچے تو بچے نے دیکھا کہ اس مینار کے سب سے اوپری حصہ پر ایک پرندے نے اپنا گھونسلہ بنا رکھا ہے۔ باپ مینار کی

تاریخ بیان کرتا رہا لیکن بچہ متواتر اس پرندہ کو دیکھتا رہا۔ جب باپ نے مینار کی تاریخ بیان کر دی اور واپس جانے کا وقت آیا تو بچے نے باپ سے کہا "ازبکستان کے رہنے والے بھی بڑے بیوقوف ہیں، ایک معمولی سے پرندے کے رہنے کے لئے اتنا بڑا مینار تعمیر کر دیا۔"

رائٹرس یونین کے جلسے سے نکلے تو غفور جہاں گشتری ہمیں ازبکستان کے مشہور ادیب اور شاعر موسیٰ ایبک کا میوزیم دکھانے لے گئے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، سوویت یونین میں ادیبوں اور فن کاروں کو بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے نام اور کام کو محفوظ کرنے کے سو سو جتن کئے جاتے ہیں۔ موسیٰ ایبک ازبکستان کے مشہور شاعر اور ادیب گذرے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے مکان کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ اس مکان میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۶۸ء تک مقیم رہے۔ پامیر کی پہاڑیوں میں ایک چوٹی بھی موسیٰ ایبک کے نام سے موسوم ہے۔ جدید ازبیک ادب میں موسیٰ ایبک کا بہت بلند مقام ہے۔ موسیٰ ایبک نے بیس تصانیف چھوڑیں۔ ۱۹۰۵ء میں وہ تاشقند میں پیدا ہوئے۔ گویا سوویت انقلاب کے وقت ان کی عمر بارہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔ انقلاب سے پہلے ازبکستان میں خواندگی کا اوسط صرف دو فی صد تھا۔ موسیٰ ایبک کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا ہے کہ انقلاب کے بعد وہ ازبکستان کے پہلے گریجویٹ بنے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی نظم "موسم سرما" کے عنوان سے کہی۔ ۱۹۲۶ء میں ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ موسیٰ ایبک نے "تزول ازبکستان" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا۔ انہوں نے ازبکستان میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے ۱۹۲۱ء میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ موسیٰ ایبک کا میوزیم اگرچہ سج چکا ہے لیکن اب بھی اس کے کئی شعبوں کی ترتیب کا کام جاری ہے۔ ان کی ذات سے وابستہ چیزوں کو نہایت سلیقہ سے سجایا گیا ہے۔ موسیٰ ایبک نے بحیثیت ادیب ساری دنیا کا دورہ کیا تھا۔

ہم میوزیم کے اس کمرے میں پہنچے جہاں موسیٰ ایبک کی تصویریں آویزاں ہیں تو ایک گروپ فوٹو کے سامنے اچانک رک سے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں موسیٰ ایبک جب پاکستان گئے تھے تو

یہ اس موقع کا گروپ فوٹو ہے۔ اس تصویر میں وہ پاکستانی ادیبوں کے ہمراہ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ ہم جب بڑی دیر تک اس تصویر کے آگے رک گئے تو غفور جہاں گستری بولے "کیا موسیٰ ایبک کی یہ تصویر آپ کو بہت پسند آئی ہے؟"

ہم نے کہا "اس تصویر کے آگے رکنے کی وجہ موسیٰ ایبک نہیں کوئی اور ہے۔"

غفور جہاں گستری نے پوچھا "کون معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں؟"

ہم نے کہا "غفور صاحب! معشوق نہیں بلکہ اس میں ہمارے بڑے بھائی صاحب موجود ہیں۔"

غفور جہاں گستری بولے "آپ کے بڑے بھائی صاحب اس تصویر میں کہاں سے پہنچ گئے۔ یہ تو پاکستانی ادیبوں کے ساتھ موسیٰ ایبک کا گروپ فوٹو ہے۔"

ہم نے کہا "آپ نے ابراہیم جلیس مرحوم کا نام سنا ہے؟"

غفور جہاں گستری بولے "آپ نام سننے کی بات کرتے ہیں میں نے تو انہیں پڑھا ہے۔"

ہم نے کہا "وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ وہ دیکھئے اس تصویر میں وہ موسیٰ ایبک کے برابر کھڑے مسکرا رہے رہیں۔ فیض احمد فیض تو ہیں ہی۔ احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، ہاجرہ مسرور بھی ہیں۔ دو چار ادیب اور بھی ہیں جنہیں ہم شکل سے نہیں پہچانتے۔"

یہ سنتے ہی غفور جہاں گستری نے میوزیم کے انچارج کو بلایا اور ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا "ان سے اس میوزیم کے شخصی تعلقات ہیں۔ ان کے بڑے بھائی کی تصویر تو آپ کے میوزیم میں ہے ہی، اب یہ خود اس میوزیم میں بنفس نفیس آئے ہیں۔"

میوزیم کے انچارج نے ہم سے اس گروپ فوٹو میں موجود بعض ادیبوں کے بارے میں پوچھا جنہیں ہم شکل سے جانتے تھے اور ان کے نام نوٹ کر لئے۔ میوزیم میں ایک کمرہ فیض احمد فیض کے لئے بھی مختص ہے۔ معلوم ہوا موسیٰ ایبک سے فیض کے بہت گہرے مراسم تھے۔ فیض ایک بار تاشقند آئے تو موسیٰ ایبک کے مہمان ہوئے۔ جس کمرہ میں وہ مقیم تھے اسے جوں کا توں محفوظ رکھا

گیا ہے۔فیض کی تصویریں بھی آویزاں دیکھی ہم نے سوچا بھلے ہی ہندوستان اور پاکستان میں فیض احمد فیض کا کوئی میوزیم نہ ہو لیکن تاشقند کے ایک میوزیم میں ان کا ایک کمرہ تو مختص ہے۔ میوزیم کے صحن میں موسیٰ ایبک کا ایک دیوہیکل مجسمہ بھی نصب ہے۔

موسیٰ ایبک میوزیم سے باہر نکلے تو ہم وفور جذبات سے مغلوب تھے۔غفور جہاں گستری بولے "چلئے اب میں آپ کو ازبکستان کی ترقی کی نمائش میں لے چلتا ہوں۔" ہم انہیں کیسے سمجھاتے کہ ہم خوش حالی سے جتنا دور بھاگنا چاہ رہے ہیں وہ ہمیں خوشحالی سے اتنا ہی قریب لے جا رہے ہیں۔راستے میں تاشقند کی کئی عظیم الشان عمارتیں اور خوبصورت مقامات نظر آئے۔ جب کوئی عالیشان اور خوبصورت عمارت نظر آتی تو غفور جہاں گستری کہتے، "یہ عمارت ۱۹۶۶ء کے زلزلہ کی دین ہے۔" جب دس بارہ عمارتوں کے بارے میں غفور جہاں گستری نے ہمیں یہی بات کہی تو ہم نے کہا "ہمارے ملک میں زلزلہ کو قہر خداوندی سمجھا جاتا ہے۔کیا ازبکستان میں زلزلہ نعمت خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں زلزلہ سے عمارتیں گر جاتی ہیں، ازبکستان کے زلزلوں میں یہ عجیب بات نظر آئی کہ اس میں عمارتیں گرنے کے بجائے زمین کے اندر سے نمودار ہو جاتی ہیں۔"

غفور جہاں گستری بولے "یہ آپ سے کس نے کہا کہ ہمارے ہاں زلزلوں میں عمارتیں نہیں گرتیں۔عمارتیں گرتی ہیں۔تبھی تو ہم نے نئی عمارتیں تعمیر کی ہیں۔اگر پرانی عمارتیں نہ گرتیں تو نئی عمارتیں کہاں سے آتیں۔"

۲۶/اپریل ۱۹۶۶ء کو تاشقند میں زلزلہ کا پہلا تباہ کن جھٹکا آیا تھا۔جس نے شہر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔آن کی آن میں تاشقند کے ۷۰ ہزار خاندان بے گھر ہو گئے۔تقریباً ۱۸ مہینوں تک تاشقند میں زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہوتے رہے جن کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بھی زائد تھی۔سوویت یونین کے کونے کونے سے ۵۰ ہزار رضا کار ساز و سامان کے ساتھ تاشقند پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے شہر کو نئی اور خوبصورت عمارتوں کے ساتھ از سر نو تعمیر کر دیا۔

غفور جہاں گستری تاشقند کی ساری خوبصورتی کو زلزلہ کی دین سمجھتے ہیں۔

● ● ●

دنیا کے غفور و ایک ہو جاؤ

غفور جہاں گستری ہمارے دورۂ ازبکستان میں ہمارے مترجم، منتظم، میزبان، ترجمان اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۸۶ء کی خوشگوار صبح کو ان سے ہماری ملاقات ہوٹل ازبکستان کی لابی میں یوں ہوئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے۔ معلوم ہوا کہ سوویت یونین کے سب سے بڑے ادبی اشاعتی مرکز ''راودگا'' میں اردو کے ایڈیٹر اور صدر شعبہ ہیں۔ تعارف کے بعد جب ہم نے ان کا نام پوچھا تو بولے ''یہ ہیچ مداں اور کمترین عوام الناس میں رخصت الائیو غفور جہاں گستری کے نام سے شناخت پذیر ہے۔'' سخن گستری سے چونکہ ہمارا پرانا تعلق ہے اس لئے جہاں گستری کی بات تو سمجھ میں آ گئی۔ لیکن رخصت الائیو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ پوچھا ''یہ رخصت الائیو کیا چیز ہے؟''

بولے ''علم و دانش اور اردو زبان و ادب کا جو ادراک مبداء فیاض سے اس ہیچ مداں کو ودیعت ہوا ہے اس کی مدد سے خاکسار نے بھی اس رخصت الائیو کے سرچشمے کی تحقیق و تدقیق کرنے کی سعی و کاوش کی ہے لیکن ناکام و نامراد رہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مشتق کیا ہے۔''

ہم نے کہا ''علم و دانش اور زبان و ادب کا جو ادراک مبداء فیاض سے ہمیں عطا ہوا ہے اس کے مطابق یہ ''رخصت الائیو'' یا تو ''رخصت اللہ'' ہے یا ''رخصت الٰہی'' ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ازبک زبان میں رخصت کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں رخصت بہت اچھی چیز ہوتی ہے۔ جیسے رخصت اتفاقی اور رخصت خاص وغیرہ۔ ہمارے سرکاری ملازمین میں بہت مقبول ہے بلکہ ان کا من بھاتا کھاجا ہے۔ عام فہم زبان میں اسے چھٹی کہتے ہیں۔ لیکن عام فہم زبان آپ کی تو سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کیسے آپ کو سمجھائیں۔ ہماری دانست میں رخصت اللہ یا

رخصت الٰہی کا عام سا مفہوم یہی ہے کہ یا تو اللہ نے آپ کو چھٹی دے رکھی ہے یا آپ نے اللہ کو۔"

بولے "مہمان گرامی قدر! اس حقیر فقیر بندہ پر تقصیر کے نام کے اسرار و رموز کو جاننے میں آپ اپنی حیات جاوداں کی عزیز ساعتیں اور بیش بہا ذہانتیں کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ناچیز کو صرف غفور کہیئے۔ آپ کے ہاں بھی یہ چیز ہوتی ہوگی۔"

ہم نے کہا "غفور نہ صرف ہمارے یہاں ہوتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے حیدرآباد دکن میں تو غفوروں کی ایک الگ قسم بھی پائی جاتی ہے جسے "ڈھ غفور" کہتے ہیں اس کی توضیح و تشریح ہم نہیں کریں گے کیونکہ ہمیں نہ صرف آپ کی دوستی بلکہ ہند۔روس دوستی بہت عزیز ہے۔ اس دنیا میں کوئی ساٹھ غفور تو خود ہمارے دوست ہیں۔ آپ اکسٹھویں غفور ہیں۔ یورپ میں پانچ غفور ہیں جو ہمارے دوست ہیں۔ امریکہ میں بھی دو غفور ہمارے دوست ہیں۔ باقی کے غفورے ہندوستان میں ہیں۔ وسط ایشیاء میں کوئی غفور ہمارا دوست نہیں تھا۔ اب خدا نے آپ کو اس منصب جلیلہ پر فائز کیا ہے۔"

ہماری بات کو سن کر غفور جہاں گستری نے خالص لکھنوی انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا "آپ کی ذرہ نوازی، غفور شناسی اور غفور پروری کا شکریہ۔ مگر ہم اصل موضوع سے روگردانی کرتے جا رہے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے رسمی طور پر آپ کا استقبال اور خیر مقدم کرنے کا زریں اور نادر موقع عنایت کیجئے۔ آپ نے ازبکستان کی سرزمین پر قدم رنجہ فرما کر ہماری عزت و توقیر میں جو اضافہ کیا ہے اس کے لئے میں سالم وکامل صمیم قلب کے ساتھ آپ کی خدمت اقدس میں اپنے شخصی و خصوصی اور ازبک عوام کے عمومی جذبات تہنیت و تشکر پیش کرتا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

ہمارے ہندوستانی ہم سفر اشتیاق عابدی نے دبی زبان میں ہم سے پوچھا "مجتبیٰ بھائی! یہ غفور صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "بڑی تکلیف کے ساتھ کتابی اردو میں ہمارا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔"

اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ اگر ازبکی زبان میں کوئی ہم سے بات کرتا تو غفور جہاں گستری "طلسم ہوشربا" والی اُردو میں اس کا ترجمہ ہمارے لئے کرتے اور بعد میں ہم غفور جہاں گستری کی اردو کا ترجمہ خود اپنی اردو میں اشتیاق عابدی کے لئے کرتے۔ پتہ نہیں غفور جہاں گستری نے یہ اردو کہاں سے سیکھی اور کیسے سیکھی۔ اردو کے ایسے مشکل، ثقیل اور متروک الفاظ جنہیں تیس چالیس برس میں ہم نے نہ کہیں سنا نہ پڑھا نہ لکھا انہیں غفور جہاں گستری کی وساطت سے ازبکستان میں سننے اور برتنے کا موقع ملا۔ ان سے مل کر نہ صرف اردو کا مستقبل روشن نظر آیا بلکہ اس کا ماضی تو اتنا روشن نظر آیا کہ ہماری بصارت اور بصیرت دونوں چکا چوند ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ موصوف فیض احمد فیض سے نہ صرف مل چکے ہیں بلکہ ان سے گھنٹوں اپنی مخصوص اردو میں تبادلہ خیال بھی کیا ہے۔ ہم نے کہا کہ "ہمیں پتہ ہے کہ آپ فیض احمد فیض سے مل چکے ہیں۔"

گہرے تجسس کے ساتھ پوچھا "آپ پر یہ حقیقت کیسے منکشف ہوئی کہ خاکسار فیض احمد فیض کی دلنواز صحبت خاص سے مستفیض و فیضیاب ہو چکا ہے۔ ہم نے کہا کہ "فیض کی شاعری پر آپ کی اردو کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ آخری عمر میں بڑی مشکل شاعری کرنے لگے تھے۔ آپ سے نہ ملتے تو ان کی شاعری میں یہ موڑ کہاں سے آتا۔"

نظریں جھکا کر اور قدرے شرما کر بولے "آپ کی غفور نوازی کا شکریہ۔" چار دن ازبکستان میں ان کے اور ان کی اردو کے ساتھ ایسے گزرے کہ ذہن کے نہاں خانے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ پہلے دن تاشقند کی سیر کرا کے رات کو وہ اپنے گھر چلے گئے تو اشتیاق عابدی نے ہم سے کہا "اب آپ اپنے بستر استراحت کو اپنے قدم میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیں تا کہ نیند آپ کو اپنی پرسکون آغوش میں سمو لے اور آپ اس جہان فانی کے آلام و مصائب نیز افکار و حوادث سے عرصہ مختصر کے لئے ہی سہی رستگاری حاصل کر سکیں۔"

ہم نے ہنس کر کہا "فیض کی شاعری کے بعد اب آپ کی نثر بھی غفور جہاں گستری کی اردو سے متاثر ہونے لگی ہے۔ عابدی صاحب! سچ تو یہ ہے کہ غفور جہاں گستری سے مل کر ہمیں بے ساختہ

بیل کی والدہ یاد آرہی ہے۔"

اشتیاق عابدی نے حیرت سے پوچھا "بیل کی والدہ! یہ کیا قصہ ہے؟"

ہم نے کہا "یہ قصہ بیس بائیس برس پرانا ہے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تلگو کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ اس کام کے لئے ایک تلگو ادیب کا انتخاب کیا گیا جو دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ جب ترجمہ ہوگیا تو یہ ترجمہ نظر ثانی کے لئے ہمارے پاس آیا۔ نہایت فصیح و بلیغ ترجمہ تھا۔ ایک المیہ افسانہ تھا جس میں ایک غریب کسان کی زندگی کو پیش کیا گیا تھا اس کہانی میں کسان کا نوجوان بیل مرجاتا ہے۔ منظر کچھ اس طرح کا تھا کہ نوجوان بیل مر چکا ہے۔ ایک طرف بیل کی نعش پڑی ہے۔ دوسری طرف کسان اداس بیٹھا ہے اور تیسری طرف وہ گائے بھی اداس کھڑی ہے جس نے اس بیل کو جنم دیا تھا۔ افسانے کا یہ موڑ نہایت متاثر کن تھا۔ لیکن مترجم نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے اس منظر کو اپنی عالمانہ اردو میں یوں بیان کیا تھا "ایک طرف تو نوجوان اور نوخیز بیل کی نعش بے گور و کفن پڑی تھی، دوسری طرف بیل کی والدہ کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔" دوسرے دن مترجم موصوف ترجمہ کے بارے میں ہماری رائے جاننے کے لئے آئے تو ہم نے کہا "ترجمہ تو نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ ہمیں پسند آیا۔ لیکن ایک افسانہ میں بیل کی والدہ کا ذکر ہے۔ اس طرز تخاطب پر ذرا نظر ثانی کرلیں تو مناسب ہے۔"

تیسرے دن وہ ترجمہ پر نظر ثانی کر کے ہمارے پاس آئے۔ ہم نے بیل کی والدہ والا صفحہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب کی بار فاضل مترجم نے "بیل کی والدہ" کو کاٹ کر "بیل کی والدہ محترمہ و معظمہ" بنا دیا تھا۔

یہ تو خیر ایک لطیفہ معترضہ تھا۔ بات غفور جہاں گستری کی ہو رہی تھی۔ جتنی مشکل اردو وہ بولتے تھے اتنے ہی سادہ انسان وہ ہمیں نظر آئے۔ جیسا کہ عام طور پر سارے غفور ہوتے ہیں۔ نہایت معصوم، مخلص، محنتی اور شریف۔ تاشقند جا کر ہی ہمیں یہ پتہ چلا کہ غفور چاہے ہندوستان میں رہیں

یا یوروپ میں یا وسط ایشیاء میں سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔اسی لئے تو ہم مذاق مذاق میں انہیں یہ نیا نعرہ دے آئے ہیں کہ "دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ۔"

ان کی پابندی وقت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ صبح آٹھ بجے آنے کے لئے کہہ جاتے تھے تو ٹھیک سات بج کر انسٹھ منٹ پر دروازے پر ان کی دستک سنائی دیتی تھی۔چونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم ادیب ہیں اسی لئے ایسی جگہوں پر لے جاتے تھے جو ادیبوں کی دلچسپی کا سبب بنیں۔

پہلے دن لینن چوک کی سیر کرا چکے تو کہنے لگے "اب میں آپ کو باغ شعراء لے چلتا ہوں جو علی شیر نوائی تھیٹر کے آگے واقع ہے۔" ہم نے کہا "غفور صاحب! مانا کہ ہم ادیب ہیں لیکن شاعروں سے نہ صرف گھبراتے ہیں بلکہ حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔سوویت یونین کا دورہ بھی اس لئے کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لئے ہی سہی اردو کے شاعروں سے ہماری جان چھوٹے اور ہم 'مکرر ارشاد' اور 'سبحان اللہ' کہنے سے بچے رہیں۔آپ تو یہاں بھی ہمیں 'باغ شعراء' میں لے جا رہے ہیں۔کہیں کسی شاعر نے ہمیں کلام سنا دیا تو؟ اور اگر اس کا کوئی شعر غلطی سے سمجھ میں آ گیا تو؟"

غفور جہاں گستری بولے "آپ خوفزدہ نہ ہوں۔میں آپ کو ان مُردہ شاعروں کے پاس لے جا رہا ہوں جو امر ہو چکے ہیں۔" ہم نے کہا "کیا مطلب؟"

بولے "باغ شعراء میں ہم کو زندہ شاعر نہیں ملیں گے۔اس باغ میں تو ازبکستان کے سارے عظیم المرتبت شاعروں کے مجسمے آپ کو دیکھنے کو ملیں گے۔"

ہم نے کہا "کیا آپ کے ہاں بھی پانی کی اتنی ہی قلت ہوتی ہے کہ حکومت ہم جیسے ادیبوں اور فنکاروں کے مجسمے نصب کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

بولے "ازبکستان میں پانی اتنا نایاب ہوا کرتا تھا کہ ہمارے لوک ادب میں پانی کے ایک قطرہ کو موتی کے ایک دانہ سے زیادہ قیمتی بتایا جاتا تھا۔لیکن مجتبیٰ صاحب! ہماری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔پانی کی قلت سے ادیبوں کے مجسموں کا کیا تعلق ہے؟"

ہم نے کہا "بہت گہرا تعلق ہے۔ ہمارے ہاں جب بھی پانی کی قلت ہو جاتی ہے تو حکومت عوام کی پیاس بجھانے اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ادیبوں اور فنکاروں کے مجسمے کھڑا کر دیتی ہے چنانچہ ہندوستان میں ہمارا تعلق جس ریاست سے ہے وہاں لوگ بوند بوند پانی کے لئے ترس رہے ہیں اور حکومت عوام پر فنکاروں کے مجسموں کی بارش برسا رہی ہے۔ ہماری ریاستی حکومت کا خیال ہے کہ جب سارے فنکاروں کے مجسمے نصب ہو جائیں گے تو ان حساس فنکاروں کے مجسموں کی آنکھوں سے عوام کی بے بسی اور مجبوری پر اتنے آنسو بہہ نکلیں گے کہ ساری ریاست میں سیلاب آ جائے گا۔"

غفور جہاں گستری کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آسان بات یوں بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بولے "ہماری حکومت عوام کا کلیجہ اس طرح ٹھنڈا نہیں کرتی۔ خیر میں آپ کے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی ریاستی سرکار ٹھیک ہی کر رہی ہو۔"

خیر تھوڑی دیر بعد ہم باغ شعراء میں تھے۔ ایسی خوبصورت اور پر فضا جگہ ہے کہ ہم جیسے شاعر دشمن کا جی بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہونے لگا۔ شاعروں کے کیسے باوقار اور پر شکوہ مجسمے ہیں۔ علی شیر نوائی، لطفی، نادرہ، مولانا مقیمی، ظہیر الدین فرقت، حکیم زادہ نیازی، عبداللہ قادری، حمید عالم جان، غفور غلام اور موسیٰ ایک اپنے اپنے ڈھنگ سے کھڑے ہیں پاس ہی ایک کونے میں بڑی سی پگڑی باندھے ایک مجسمہ کھڑا تھا۔ ہم نے پوچھا "آپ کی تعریف؟"

غفور جہاں گستری بولے "یہ بابور ہے بابور۔ ازبکستان کا مشہور دانشور اور شاعر اس کے "بابر نامہ" کا ذکر تو آپ نے سنا ہوگا۔"

یہ سنتے ہی ہمارا سر تعظیماً جھک گیا اور ہم نے غفور جہاں گستری سے کہا "غفور صاحب! خبردار، با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔ آپ جس بابور کا ذکر یوں سرسری طور پر کر رہے ہیں وہ ہمارے سلطان ابن سلطان، خاقان ابن خاقان، بانی، سلطنت مغلیہ، گیتی پناہ، شہنشاہ ہندوستان، ظل سبحانی، اعلیٰ حضرت ظہیر الدین محمد بابر ہیں۔ کم از کم ان کا نام تو احترام سے لیجئے۔ یہ ہمارے

حکمران رہ چکے ہیں۔"

غفور جہاں گستری بولے "ہوں گے آپ کے حکمران۔ مگر یہاں تو بابو ردلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس کے شعر کا سکہ چلتا ہے اور اس کے علم کا ڈنکا بجتا ہے۔"

سوویت یونین میں ادیبوں اور فنکاروں کی جو عزت ہے اسے دیکھ کر ہم کچھ اور بھی احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے۔ شاہراہیں ان کے نام سے ہیں، پہاڑوں کی چوٹیاں فنکاروں کے ناموں سے منسوب ہیں۔ تاشقند کے کئی اسٹیشنوں کے نام بھی شاعروں ہی کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ ہم نے غفور جہاں گستری سے پوچھا "اتنے دیوہیکل اور بھاری مجسموں کی تیاری پر کتنا خرچ آتا ہوگا۔"

بولے "ایک ایک مجسمہ پر کئی کئی ہزار روبل خرچ آتا ہے؟" ہم نے کہا "اگر آپ ازراہ ادب نوازی ہمیں بھی روزانہ صرف دس روبل دیا کریں تو ہم خود بہ نفس نفیس بطور مجسمہ آپ کے باغ شعراء میں کھڑے ہونے کو تیار ہیں۔ اتنا سستا مجسمہ آپ کو نہیں ملے گا۔"

ہمیں غفور جہاں گستری پر اس وقت غصہ آیا جب انہوں نے ہماری پیشکش کو ہنس کر ٹال دیا۔ بولے "اپنے ملک میں پانی کی قلت کی دعا کیجئے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دن خود آپ کے شہر میں آپ کا مجسمہ کھڑا ہو جائے۔" اور ہم نے بات کو کاٹ کر کہا "جس پر تھکے ماندے پرندے بیٹھ کر بیٹ کرتے رہیں گے۔"

ازبکستان میں پہلے ہی دن سے وہ ہماری صحت کے بارے میں ضروری اور غیر ضروری ہدایتیں دیا کرتے تھے۔ ہمیں چھینک بھی آ جاتی تو ان کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ کہتے تھے آپ کو ازبکستان سے ماسکو اور لینن گراڈ بھی جانا ہے۔ ماسکو پہنچنے تک آپ کی صحت کو ٹھیک رکھنے کی ذمہ داری میری ہے۔ اسی لئے اپنی صحت کی حفاظت کیجئے۔ بخارا کی سیر سے ہم دوبارہ تاشقند واپس آنے لگے تو اچانک بخارا کا موسم بے حد سرد ہو گیا۔ لوگوں کا بیان تھا کہ پچھلے پچاس برس میں ایسا موسم دیکھنے کو نہیں ملا۔

ہم رات کو چھوٹے سے طیارہ کے ذریعہ بخارا سے تاشقند آئے۔ پون گھنٹے کی پرواز میں وہ

بار بار ہمارا حال پوچھتے رہے کہ بخارا کے موسم کی وجہ سے کہیں آپ کو بخار تو نہیں آ رہا ہے۔ آنکھوں میں کہیں جلن تو نہیں ہو رہی ہے۔ اشتیاق عابدی نے طیارہ میں کھانسنا شروع کیا تو بے چین سے ہونے لگے۔ رات کو ہمیں ہوٹل پر چھوڑ کر جانے لگے تو بولے "بخارا کے سرد اور غیر متوقع موسم کے لئے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ میرے اختیار میں نہیں تھا کہ بخارا کو اس موسم سے اور اس موسم کو آپ سے بچاتا۔ کل تاشقند میں آپ کا بے حد مصروف آخری دن ہے۔ کئی جلسوں میں آپ کو شرکت کرنی ہے اور خطاب بھی کرنا ہے۔ اپنی صحت کو ٹھیک رکھئے اور ہو سکے تو اپنی اپنی تقریروں کی تیاری بھی کر لیجئے۔ میں صبح آٹھ بجے کمرے پر آ جاؤں گا۔"

اس بار اشتیاق عابدی کو اور ہمیں ایک بڑے ڈبل بیڈ والے کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ ہم حسب عادت گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ صبح پانچ بجے ہماری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اشتیاق عابدی اپنے بستر میں پڑے ہندرروس دوستی کے موضوع پر بہ آواز بلند تقریر کر رہے ہیں۔ ہم بھی کچھ کم چالاک نہیں ہیں۔ بڑی آہستگی کے ساتھ میز پر سے قلم کاغذ اٹھایا اور لگے ان کی تقریر کے اہم نکات نوٹ کرنے۔ اشتیاق عابدی کہے چلے جا رہے تھے:

"ہندرروس دوستی کے بغیر عالمی امن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ روس کی دوستی وقت کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی دوستی ہے۔ سوویت یونین نے کب کب اور کہاں کہاں اور کیسے کیسے کٹھن وقت میں ہماری مدد کی ہے۔ میری لتاں! میری لتاں! (کراہنے کی آواز)" تقریر تو ان کی بہت مدلل اور اثر انگیز تھی مگر یہ درمیان میں "میری لتاں! میری لتاں" کی تکرار سے ہمیں تشویش سی ہوئی۔ دبے پاؤں ان کے قریب جا کر ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا جیسے ہم نے جلتے ہوئے توے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہم نے انہیں جگانے کی کوشش کی تو ایک عجیب سی بحرانی کیفیت میں پوچھا "کون ہے؟"

ہم نے کہا "آپ کا دوست ہوں مجتبیٰ۔"

کروٹ بدلتے ہوئے بولے "کوئی مجتبیٰ میرا دوست نہیں ہے۔ سوویت یونین ہی میرا واحد

دوست ہے۔ مجھے سوویت یونین کی دوستی پر فخر ہے، میری لتاں! میری لتاں"۔

ہم نے تاڑ لیا کہ معاملہ سنگین ہو گیا ہے۔ دیار غیر میں کس سے مدد طلب کریں اور طلب کریں بھی تو کس زبان میں۔ ہم جس زبان میں اپنا مدعا یا مرض کی کیفیتیں بیان کرتے ہیں اس کو جاننے والے تو غفور جہاں گستری ہی ہیں جو ڈھائی گھنٹوں بعد آئیں گے۔ ہندوستان سے ہم مختلف النوع امراض کی جو دوائیں اپنے ساتھ لے گئے تھے، اشتیاق عابدی کو دیں۔ مگر ان کی ہندر روس دوستی میں کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ آخر میں تو امریکہ کو کھلم کھلا گالیاں تک دینے لگے۔ ٹھیک سات بج کر انسٹھ منٹ پر غفور جہاں گستری آئے تو ہم نے انہیں سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ یہ سنتے ہی غفور جہاں گستری پسینہ میں شرابور ہو گئے۔ چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ ہم نے انہیں تھام لیا اور کہا "ہمارے یہاں آداب تیمارداری ایسے نہیں ہوتے۔ تیماردار کو کٹھور دل کا ہونا چاہئے۔" غفور جہاں گستری نے ہماری کوئی بات نہیں سنی اور اچانک کمرہ سے چلے گئے۔ پانچ ہی منٹ بعد وہ دو عدد لیڈی ڈاکٹروں، تین عدد نرسوں اور ایک اسٹریچر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ڈاکٹروں نے اشتیاق عابدی کا معائنہ شروع کر دیا تو خود پسینہ پونچھتے ہوئے بولے "میں نے سارے انتظامات کر لئے ہیں۔ نیچے ایمبولینس گاڑی بھی کھڑی ہے۔"

ہم نے کہا "اور اس کے بعد کے انتظامات کے بارے میں بھی کہہ دیا ہوگا۔"

انہوں نے ہماری بات سنی ان سنی کر دی۔ انہیں ہماری بات کو سننے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ اشتیاق عابدی کے ناں، ناں کرتے لیڈی ڈاکٹروں نے ان کے دونوں کولہوں پر دو انجکشن داغ دیئے اور کہا "دو گھنٹوں کے اندر اگر انہیں پسینہ آ گیا تو تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پروگرام کے مطابق دس بجے ادارہ شرقیات میں ہمارا خیر مقدم تھا۔ بس کو اشتیاق عابدی کے پاس چھوڑ کر ہم اکیلے ہی سوئے مقتل چلے۔ اشتیاق عابدی سے کہا "آپ فکر نہ کریں ہم سنبھال لیں گے۔ ہندوستان کی طرف سے اچھی سی تقریر بھی کر دیں گے۔ رات کو آپ کی تقریر تو ہم نے سن ہی لی ہے۔ اس میں سے 'میری لتاں! میری لتاں' کو نکال کر باقی تقریر کر دیں گے۔"

دو گھنٹے بعد ہم واپس آئے تو اشتیاق عابدی بدستور تقریر کیے جا رہے تھے اور پسینہ کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اب غفور جہاں گستری کی پریشانی بے قابو ہوگئی اور وہ پسینہ میں شرابور ہونے لگے۔ وحشت میں بولے "شومئی قسمت سے یہ بہت برا ہو رہا ہے۔ ہم تاشقند میں ہندوستانی مہمانوں کے تعلق سے بہت فکرمند رہتے ہیں۔ اگر عابدی صاحب کو فوراً پسینہ نہ آیا تو ہم انہیں ماسکو نہیں جانے دیں گے۔ یہیں سے اسپتال میں داخل کرا دیں گے۔ آپ ماسکو چلے جائیے۔ یوں بھی ان کا تاشقند سے ہندوستان واپس جانا زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان کے ماسکو سے ہندوستان جانے کے۔"

یہ سنتے ہی اشتیاق عابدی رضائی پھینک کر کھڑے ہوئے اور ان کے جسم سے پسینہ کا وہ سیلاب اُمڈا کہ اسی سے غسل صحت فرمانے لگے۔ معصومیت میں لپٹی ہوئی غفور جہاں گستری کی سچ بات کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ اشتیاق عابدی کو پسینہ میں شرابور دیکھ کر غفور جہاں گستری کے چہرے پر سکون اور مسرت کے وہ آثار دکھائی دیئے جو عموماً ایک بچہ کو جنم دینے کے بعد ماں کے چہرے پر دکھائی دیتے ہیں۔

• • •

جدہ میں جشن طنز و مزاح

ایک خطبہ صدارت

سب سے پہلے تو میں "بزم اردو جدہ" کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی عنایت سے آج اس محفل میں مجھے خواہ مخواہ ہی کسی نامعقول شخص کو نہایت احترام کے ساتھ "جناب صدر، جناب صدر" کہہ کر مخاطب نہیں کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ اتفاق سے یا معقول شخص میں خود ہوں۔ جو لوگ کہنے اور ہونے کے نازک فرق کو جانتے ہیں ■■ اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ جب تک کسی شئے کے ہونے کی بشارت نہ دی جائے تب تک وہ نہیں ہو سکتی۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کارکنان بزم اردو جدہ کی یہ جدت نہیں تو اور کیا ہے کہ انہوں نے مجھ ناچیز کو بیک وقت تین محفلوں کا اکلوتا صدر مقرر کر دیا ہے یعنی ادبی اجلاس، محفل لطیفہ گوئی اور محفل غزل کا مشترک صدر۔ تاہم صدارت کے معاملے میں عہدیداران بزم اردو جدہ کی اس فراخ دلی کے باوجود مجھے ان سے کوتاہ دلی کی شکایت ہے۔ کوتاہ دلی ان معنوں میں کہ شرعاً میں بیک وقت چار صدارتوں کا بھی مستحق ہو سکتا تھا۔ بھلے ہی متحمل نہ ہو سکوں۔ شرع کے معاملے میں ہم بہت سی باتوں کے متحمل نہیں ہوتے لیکن مستحق ہونے کا دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں۔

پتہ نہیں منتظمین کو کیا سوجھی کہ انہوں نے مجھے بیک وقت تین محفلوں کا صدر بنا دیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ ہمارے ملک میں مشرق وسطیٰ کے کسی ملک سے جب بھی کوئی آتا ہے تو اس

کے ہاتھوں میں ''تو ان ون''، ''تھری ان ون'' کو ضرور تلاش کرتے ہیں۔ میں بھی شاید ''تھری ان ون'' قسم کا صدر ہوں۔ ایک ایسا ہمہ مقصدی اور ہم جہتی صدر جس کی صدارت کے آخری دور میں صدارت کی سنگت طبلہ اور ہارمونیم پر بھی کی جائے گی۔ وطن مالوف میں ہم تو یہ سنتے آئے ہیں کہ سعودی عرب وافر مال ومتاع اور اشیاء کی افراط وتفریط کیلئے مشہور ہے۔ جہاں پانی کی ایک بوند درکار ہو وہاں دریا بھی بہا دئے جاتے ہیں۔ لیکن صدور کے معاملے میں اس قلت کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ماشاء اللہ اپنے وطن میں تو صدور کی اتنی بہتات ہوتی ہے کہ ایک ایک محفل کی صدارت کے لئے دس دس صدر آس لگائے کھڑے رہتے ہیں۔ صدور کی اسی کثرت کا نتیجہ ہے کہ کتے کے پتھر مارنے جاؤ تو وہ صدر کے لگ جاتا ہے۔ بعض جلیل القدر صدر تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو جلسوں کی صدارت کرنے کی آس میں جلسہ کے آغاز سے پہلے لوگوں سے نظریں بچا کر جلسہ گاہ میں جھاڑو لگانے اور جلسہ کے اختتام کے بعد بوریاں اور کرسیاں تک اٹھانے کیلئے آما رہتے ہیں۔ اس پر مستزاد منتظمین کو یہ بیش بہا عطیات سے بھی نوازتے ہیں۔ افراتفری کے اس ماحول میں آپ نے مجھ کمترین کو صدق دل کے ساتھ تین محفلوں کا اکلوتا صدر بنا کر یہ ثابت کر دیا کہ بعض صورتوں میں داڑھی سے مونچھیں بھی بڑی ہو سکتی ہیں۔

حضرات! میں یہ عرض کرتا چلوں کہ اپنے وطن میں، میں نے جلسوں کی صدارت سے اس دن سے توبہ کر لی ہے جب ایک جلسہ کے صدر کی حیثیت سے میں نے منتظمین کو تاکید کی تھی کہ وہ صدر جلسہ کو دس ہار پہنائیں۔ حتیٰ کہ منتظمین کو ہاروں کی رائج الوقت قیمت کے مطابق پیشگی رقم تک دے دی تھی۔ لیکن افسوس کہ منتظمین جلسہ کو ایک ہار تک پہنانے کی توفیق عطا نہیں ہوئی۔ اس دن میری گردن ہاروں کے بوجھ سے نہیں بلکہ شرم سے جھک گئی اور اب تک جھکی ہوئی ہے۔ ملکی منتظمین جلسہ پر سے میرا اعتماد اب اٹھ سا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض جلسوں کے منتظمین نے بعد میں میرا اعتماد پھر سے بحال کرنے کی خاطر یہ انمول تجویز بھی پیش کی کہ میں انہیں ہاروں کی پیشگی رقم دینے کے بجائے رقم کی ادائیگی کا یہ اصول مقرر کروں کہ ادھر ڈائس پر ایک ہار میری گردن میں پڑے اور میں ہار پہنانے والے کو مصافحہ کرنے کے بہانے چپکے سے اس کے ہاتھ

میں ہار کی قیمت رکھتا چلا جاؤں۔

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اب آپ سے کیا چھپانا کہ اس تجویز پر بھی عمل کر کے دیکھ لیا۔ جلسہ کی صدارت تو نہ ہو سکی البتہ پہلے ہی ہار کی قیمت کے مسئلہ پر بھرے مجمع کے سامنے ہم میں اور منتظمین میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بھاؤ تاؤ کرنے کی بہت کوشش کی۔ سودا طے نہیں پا سکا تو ہم دو روپے کا ایک ہار دس روپے میں پہن کر غصہ میں ڈائس سے اتر آئے۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ہم سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن گھاٹے کا سودا نہیں کر سکتے۔

حضرات! ہم صدر جلسہ کے فرائض سے بخوبی واقف ہیں۔ صدر جلسہ کا ایک فرض تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جلسہ کی کارروائی اور اس کے انعقاد کی غرض و غایت کو جانے بغیر گھنٹوں کرسی صدارت پر بیٹھ سکے۔ ایک منزل تو وہ بھی آتی ہے جب یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ صدر کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور کرسی صدارت کہاں پر ختم ہو رہی ہے۔ صدر اور کرسی صدارت دونوں یک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ ہمیں اس وقت اس معصوم بچے کی یاد آ رہی ہے جو اپنے باپ کے ساتھ ایک جلسہ میں شرکت کیلئے گیا تھا۔ اس نے لگاتار کئی گھنٹوں تک کرسی صدارت پر بیٹھے ہوئے جامد و ساکت صدر جلسہ کو بغور دیکھنے کے بعد اپنے باپ سے بصد اشتیاق پوچھا تھا ''ڈیڈی! کیا صدر جلسہ کی چھ ٹانگیں ہوتی ہیں؟''

اس پر باپ نے اس معصوم کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے سمجھایا تھا ''نہیں بیٹا! ان چھ ٹانگوں میں سے دو ٹانگیں صدر جلسہ کی ہیں اور باقی چار ٹانگیں کرسی صدارت کی ہیں۔ جب جلسہ ختم ہو گا تو تم دیکھو گے کہ دو ٹانگیں تو صدر جلسہ کے ساتھ چلی جائیں گی اور باقی ماندہ ٹانگیں کرسی صدارت میں ہی لگی رہیں گی۔ صدر چاہے کتنا ہی معذور اور مفلوج کیوں نہ ہو چل سکتا ہے لیکن کرسی صدارت نہیں چل سکتی۔''

حضرات! آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ صدر محفل چاہے کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو اسے اپنے خطبۂ صدارت میں دو چار ایسی سنجیدہ باتیں ضرور کہنی پڑتی ہیں جن پر کوئی عمل نہ کر سکے۔ اس رعایت سے مجھے بھی کچھ سنجیدہ باتوں کے کہنے کا حق حاصل ہے۔ بزم اردو جدہ کی سرگرمیوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ دیار غیر میں رہتے ہوئے آپ اردو کے لئے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو اصولاً ہمیں کرنا چاہئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کے لئے استطاعت اور توفیق دونوں نہایت ضروری ہیں اور اپنے ملک میں یہ حال ہے کہ جس کے پاس استطاعت ہے اسے توفیق نہیں عطا ہوتی اور جسے توفیق عطا ہوتی ہے اس کے پاس استطاعت نہیں ہوتی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ استطاعت اور توفیق دونوں کی دولت سے مالا مال ہیں۔ بزم اردو جدہ نے برصغیر ہندو پاک کے طنز و مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ایک نیک کام انجام دیا ہے جو اس کے کئی نیک کاموں سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ افضل بھی ہے۔ بزم اردو جدہ نے پچھلے ہفتہ جو مزاحیہ مشاعرہ برپا کیا تھا ویسا مشاعرہ میں نے اپنی تیس سالہ ادبی زندگی میں نہ کبھی دیکھا اور نہ سنا۔ برصغیر کے سارے بڑے اور اہم شاعر اس مزاحیہ مشاعرہ میں جمع تھے۔ شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ایسا ہی ہے جیسے مینڈکوں کو ایک پسیری میں پکڑنا۔ یہ سارے شاعر اگر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مینڈکوں نے اب اپنی فطرت بدل لی ہے بلکہ سارا کمال بزم اردو جدہ کی پسیری کا ہے جس کے دامن میں ہر کوئی کھنچا چلا آتا ہے۔

اردو کے ایک ادنیٰ مزاح نگار کی حیثیت سے یہ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ جب تک ہر انسان کو اس کے حصے کی سچی خوشیاں اور مسرتیں نہیں مل جاتیں تب تک اس دھرتی پر دائمی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ قدیم وحشی انسان کے قہقہے سے لے کر آج کے انسان کے قہقہے تک تہذیب نے ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ لیکن جدید معاشرہ کے تضادات اور کشمکش نے مہذب انسان کے قہقہے کے اصلی روپ کو بدلنا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں جہاں رونا چاہئے وہاں ہنس دیتے ہیں اور جہاں ہنسنا چاہئے وہاں رو دیتے ہیں۔ اہمیت صرف ہنسی کی نہیں ہے بلکہ اس بات کی ہے کہ کب ہنسا جائے، کیسے ہنسا جائے، کتنا ہنسا جائے اور کس پر ہنسا جائے۔ ہمارا معاشرہ دن بدن کچھ اتنا تیز رفتار اور پیچیدہ ہوتا جا رہا

ہے کہ ہم زندگی کی خوشگواریوں، لطافتوں اور نزاکتوں کو فراموش کرتے چلے جارہے ہیں۔ پرسوں میں نے ایک دوست کو ایک لطیفہ سنایا تو اس نے لطیفہ پر ہنسنے کی بجائے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا ''یار! اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ تمہارے لطیفے کے ساتھ انصاف نہیں کرسکوں گا۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس لطیفہ پر گھر جا کر ذرا اطمینان قلب کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کروں گا۔''

حضرات! میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک سچے، مہذب اور مخلص انسان کے قہقہے کی بازیافت نہیں ہوجاتی تب تک یہی ہوتا رہے گا۔ اس سلسلے میں مزاح نگار بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ ظرافت نگاری کے لئے آدمی ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ طنز و مزاح کی یہ محفل اس ارض مقدس پر منعقد ہو رہی ہے جہاں چودہ سو برس پہلے ساری انسانیت ایک نئی تہذیب اور ایک نئی روشنی سے روشناس ہوئی تھی۔ اس روشنی نے انسانیت کو جینے کا ایک نیا سلیقہ اور نیا آہنگ عطا کیا تھا۔ تہذیب ہی انسان کو ہنسنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کائنات میں انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جسے خدا نے ہنسی کی دولت عطا کی ہے۔ فرشتے تک اس بیش بہا دولت سے محروم ہیں۔ اس بات سے بھی ہنسی کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

سب سے آخر میں بزم اردو کے کارکنان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے وسیلے سے مجھے اس ارض مقدس پر حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر شمس بابر، صدر بزم اردو جدہ کے نام اور کام سے میں بہت پہلے سے واقف تھا تاہم ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی سرگرمیوں کے حساب سے میں تو انہیں ادب اور فلسفے وغیرہ کا ڈاکٹر سمجھتا تھا۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ سچ مچ بیماریوں اور دوائیوں والے ڈاکٹر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو ڈاکٹر اردو زبان میں اور اس زبان کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرتا ہے اس کے پاس نہ جانے کیوں بار بار جانے کو جی چاہتا ہے چاہے آپ صحت مند ہی کیوں نہ ہوں۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ وطن مالوف میں ہمارے ایک دوست ہیں۔ ڈاکٹر رام پرشاد، خالص اور ٹھیٹ اردو علاج کرتے ہیں۔ جب یہ اپنے میٹھے

لہجے کے ساتھ خالص اردو میں پرسش احوال کرتے ہیں تو ساری بیماریوں کے آثار بدن سے یکسر غائب ہو جاتے ہیں۔ بارہا مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر رام پرشاد کے پاس جاتا ہوں اور وہ اپنی مخصوص اردو میں جب بڑے چاؤ سے میرا حال پوچھتے ہیں تو لگتا ہے شریانوں میں پہاڑی نالہ کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا خون اچانک ایک وشال سمندر کی طرح شانت ہو گیا ہے۔ فرماتے ہیں "حضور والا! آپ کا بلڈ پریشر تو صدفی صد معتدل ہے۔" اور میں کہتا ہوں "ڈاکٹر صاحب! قصور میری بیماری کا نہیں بلکہ آپ کی اردو کا ہے۔ آپ مرض کی کیفیت مجھ سے کسی اور زبان میں پوچھ کر تو دیکھیں تب آپ کو پتہ چلے گا کہ میرا بلڈ پریشر غیر معتدل ہے۔ سارا گھپلا میرے مرض کا نہیں، آپ کی اردو کا ہے۔ آپ کی اردو سے میرے منہ پر جو رونق آجاتی ہے۔ اس سے آپ سمجھتے ہیں کہ میرا حال اچھا ہے۔"

ڈاکٹر شمس بابر کے طریقہ علاج سے میں سراسر ناواقف ہوں۔ لیکن قیاس اغلب ہے کہ ان کے اکثر مریض تو ان کی اردو سے ہی ٹھیک ہو جاتے ہوں گے۔ ڈاکٹر شمس بابر ادب کا نہایت نکھرا اور ستھرا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔ آخر کیوں نہ رکھیں۔ اردو کے اولین ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کی پانچویں پشت سے جو تعلق رکھتے ہیں۔ میں انہیں پچھلے دس دنوں سے لگاتار دیکھ رہا ہوں۔ اردو ان کے لئے اوڑھنا بچھونا تو ہو سکتی ہے لیکن اردو میں اٹھنا بیٹھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی اس زبان کو اپنی طرز معاشرت اور زاویہ نگاہ کا حصہ نہ بنا لے۔ کیا عجب کہ اردو زبان ان کے طریقہ علاج کا بھی ایک لازمی جز ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنے مریضوں کو ضروری دوائیں دینے کے بعد ایسے نسخے بھی تجویز فرماتے ہوں کہ "میاں! صبح میں ناشتہ سے پہلے میر کے دو شعر پانی کے ساتھ پڑھ جاؤ اور رات میں سونے سے پہلے غالب کی ایک غزل دودھ کے ساتھ پی جاؤ۔" یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بعض مخصوص امراض کے علاج کے لئے مریضوں کو کسی شاعر کا مجموعہ کلام بھی مطالعہ کے لئے دیتے ہوں اور قیاس اغلب ہے کہ اس مجموعہ کلام پر جلی حروف میں یہ عبارت بھی درج ہوتی ہوگی، "SHAKE THE BOOK BEFORE USE."

کسی نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر شمس بابر پچھلے ایک مہینے سے مزاحیہ مشاعرے کے انعقاد کے لئے دن رات مصروف عمل رہے ہیں اور اپنے مریضوں کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ نہیں دے پا رہے ہیں۔اس پر میں نے ان کے سامنے ایک جائز اندیشہ کا اظہار کیا کہ اگر اس عرصے میں ان کی عدم توجہی کے باعث ان کے مریض خدانخواستہ خود بخود شفایاب ہو جائیں تو کیا ہوگا۔اس کے جواب میں ڈاکٹر شمس بابر کے ہونٹوں پر ایک ایسی اردو مسکراہٹ پھیل گئی جو اردو زبان اور ان کے مریض دونوں کی سخت جانی پر ان کے بھرپور اعتماد کی ترجمان تھی۔وہ یوں ہنسے جیسے کہنا چاہتے ہوں ان کی زبان اور ان کے مریض ہڈیاں تو رگڑ سکتے ہیں لیکن مر نہیں سکتے۔

ایک اچھے ڈاکٹر ہونے کے باوجود ایک نہایت مخلص، بے لوث، نیک نفس اور شریف انسان ہیں۔ڈاکٹروں میں اور تو کئی خوبیاں ہو سکتی ہیں لیکن مندرجہ بالا خوبیاں تو کئی پتھالوجیکل ٹیسٹس کے باوجود کسی ڈاکٹر میں تلاش نہیں کی جا سکتیں۔جو ڈاکٹر غلطی سے بے حد شریف النفس واقع ہوتا ہے اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر کم از کم مجھے تو شبہ سا ہونے لگتا ہے۔یہ میرا عقیدہ ہی نہیں تجربہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اکثر مریض ڈاکٹر کی دوا سے کم اور اس کی جھڑکی سے زیادہ شفایاب ہوتے ہیں۔

یادش بخیر! وطن مالوف کے ایک اور شریف النفس ڈاکٹر کی مجھے یاد آ گئی جو اپنے مریضوں کی کثرت کے علاوہ اپنی بیویوں کی کثرت کے لئے بھی شہرت رکھتے ہیں ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا ''حضور! آخر آپ نے اتنی ساری شادیاں کس طرح کر لیں؟''

نظریں جھکا کر بولے ''خدا گواہ ہے اس میں میری ذاتی کاوشوں اور کوششوں کو بالکل دخل نہیں ہے۔کم از کم دو شادیاں تو اس طرح ہوئیں کہ میں نے مریضہ جان کر ان کی نبض مبارک پر ہاتھ رکھا اور مریضہ نے دبی زبان میں فرمایا ''دیکھئے ڈاکٹر صاحب! یہ جو آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے تو وعدہ کیجئے کہ زندگی بھر میرا ہاتھ اور ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔سچا مرد وہی ہوتا ہے جو ایک بار ہاتھ پکڑتا ہے تو زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتا۔'' چار و ناچار مجھے نباض سے شوہر اور انہیں مریضہ سے میری اہلیہ بننا پڑا۔یہ تو خیر ایک لطیفہ معترضہ تھا۔ڈاکٹر شمس بابر ان لوگوں میں سے ہیں جن سے مل کر

انسان اور انسانیت پر پھر سے اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔

میں یہاں اپنے عزیز ترین دوست اور بزم اردو جدہ کے معتمد عمومی شریف اسلم کا ذکر کرنا بھی ضروری تصور کرتا ہوں۔ میں ان کا شکریہ اس ڈر سے ادا نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں وہ اسے سچ مچ قبول نہ کر لیں۔ میں جانتا ہوں کہ ''قبول کیا'' والا جملہ ان کے لئے تکیہ کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ شریف اسلم میرے اس زمانے کے دوست ہیں جب آتش نہ صرف جوان تھا بلکہ ابھی بچہ تھا۔ یہ پل دو پل کی بات نہیں نصف صدی کا قصہ ہے۔ شریف اسلم کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ ہم دونوں کے ایسے کئی راز ہیں جو ہم دونوں کے سینوں میں دفن ہیں اور اب جب کہ ہم اپنی اپنی تاریخ پیدائش سے دور اور اپنی تاریخ وفات سے قریب ہوتے جا رہے ہیں ان رازوں کا پوشیدہ رہنا ہی بہتر ہے۔ شریف اسلم یہاں آ کر جس طرح کی منظم، معتدل اور صالح زندگی گذار رہے ہیں اسے دیکھ کر یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ آدمی اگر شریف اسلم بھی ہو تو اس کے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس یار طرحدار کی کتنی باتیں ہیں جو اب یاد آ رہی ہیں۔ مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ہم ان باتوں کی دہلیز کو پھلانگ کر بہت آگے نکل آئے ہیں۔

میں یہاں خصوصیت کے ساتھ حیدرآباد کی مشہور سماجی کارکن محترمہ سلیم اشرف صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ ہندوستان کے شعراء اور ادیبوں کو یہاں لانے کا سہرا سلیم آپا کے سر ہے۔ سفر سے پہلے، سفر کے دوران اور سفر کے بعد انہوں نے جس طرح ہمارا خیال رکھا اور اب تک رکھتی چلی جا رہی ہیں اس کا شکریہ لفظوں میں ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ بہن کی محبت کیا چیز ہوتی ہے اسے میں تقریباً بھول چکا تھا۔ سلیم آپا کی نگرانی میں یہاں تک سفر کرنے کے دوران میں، میں نے نئے سرے سے بہن کی محبت کی بازیافت کی ہے۔ ان کی فراخدلانہ مہمان نوازی مدتوں یاد آتی رہے گی۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ اپنے وطن واپس جا کر میں پھر سے اپنی دال روٹی پر کس طرح گزارہ کروں گا۔

حضرات! جب میں یہاں آیا تھا تو گناہوں کا بوجھ میرے کندھوں پر تھا اور اب واپس

جانے لگا ہوں تو آپ سب کے احسانات کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔ ہوائی جہاز میں شاید میں اس بوجھ کو "ہینڈ کیری" HAND CARRY بھی نہ کر سکوں گا۔ اس لئے اس بوجھ کو دل میں چھپا کر لے جاؤں گا کیونکہ جسم کا یہی تو وہ عضو ہے جو بوجھ اٹھانے پر آتا ہے تو غموں کے بھاری پہاڑوں تک کو اٹھا لیتا ہے۔

میں پھر ایک بار بزم اردو جدہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی معرفت مجھے اس ارض مقدس پر آنے کی سعادت حاصل ہو سکی۔ اردو کی بعض بستیاں اجڑ رہی ہیں تو نئی بستیاں آباد بھی ہو رہی ہیں۔ اور ان بستیوں کو آباد کرنے میں آپ حضرات کی بے لوث کاوشوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

● ● ●

رام پور میں دو دن

ادھر کچھ دنوں سے شمالی ہند کے شہروں میں خاصا طنز و مزاح ہو رہا ہے (ادب اور سیاست دونوں سطحوں پر) لکھنؤ، چندی گڑھ اور پٹنہ تو خیر بڑے شہر ہیں، امروہہ تک طنز و مزاح کی زد میں آ چکا ہے۔ چنانچہ پچھلے دس مہینوں میں ہم دو بار وہاں جا چکے ہیں۔ تیسری مرتبہ بھی بلایا تھا مگر ہم اس ڈر سے نہیں گئے کہ کہیں امروہہ والوں کو طنز و مزاح کی بدہضمی نہ ہو جائے۔ اس بار رام پور والوں کی غیرت نے للکارا تو ۶ مارچ کو ایک "شب قہقہہ" کا اہتمام کر ڈالا۔ ہمیں طنز و مزاح سے کچھ زیادہ سروکار نہیں ہے۔ ہماری خواہش تو بس اتنی رہتی ہے کہ بس طنز و مزاح کی آڑ میں کچھ شہر دیکھنے کو مل جائیں۔ رام پور جانے کو یوں بھی جی چاہتا تھا اس لئے کہ اتر پردیش میں اردو کے جو چند جزیرے باقی رہ گئے ہیں ان میں رام پور خاصا بڑا جزیرہ ہے۔ پھر رام پور کے نوابوں اور شاعروں سے ہماری یاد اللہ ہے۔ غضب کے شعر کہتے ہیں مگر گوشہ نشینی کی زندگی گذارتے ہیں اور اپنی گوشہ نشینی کو رام پور کی مخصوص تہذیبی روایت کی پاسداری کا نام دیتے ہیں۔ رام پور میں شاعروں کی بہتات کے بارے میں کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ تین سال قبل ایک ادب دوست نے رام پور کے شاعروں کی ایک فہرست مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ پانچ سو شاعروں کی فہرست مرتب ہو چکی تھی کہ بیچارے ادب دوست کو داعی اجل نے لبیک کہنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد سے کسی نے اس فہرست کو آگے نہیں بڑھایا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہم رام پور جانے لگے تو ہمارے ایک رامپوری دوست نے تنبیہ کے انداز کہا "بھیا رام پور جاؤ تو وہاں کوئی پتھر نہ اٹھانا۔"

ہم نے پوچھا "کیا پتھر کے نیچے سے بچھو نکلتا ہے؟" بولے "نہیں اردو کا شاعر سلام عرض کرتا ہوا برآمد ہوتا ہے اور پھر مطلع کا ڈنک مارتا ہے۔"

چنانچہ رام پور میں دو روزہ قیام کے دوران ہم نے کوئی پتھر نہیں اٹھایا۔ تاہم جس ہوٹل میں ہم فروکش تھے اس کے بیرے نے ازراہ عنایت اپنی بیاض میں سے دس بعد دو غزلیں چھوٹی بحر میں سنائیں اور بعد میں اسی بیاض پر اپنی شاعری کے بارے میں ہم سے رائے بھی لکھوالی۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی شاعر کے کلام کے بارے میں ہم نے اپنی قیمتی رائے دی۔ رائے دینے میں ایک لالچ یہ بھی تھا کہ ہمیں ہوٹل میں وقت پر چائے مل جائے اور کھانا وغیرہ بھی اچھا ملے۔ سو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں کھانا ہمیشہ بڑی بحر میں ملا۔

رام پور کی ''شب قہقہہ'' میں جو کچھ ہوا اس کا حال ہم اس لئے نہیں لکھیں گے کہ عموماً ایسے پروگراموں میں ہنسنے ہنسانے اور ٹھی ٹھا ٹھا کرنے کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مگر طنز و مزاح کے لئے لوگوں کی دلچسپی پر ہمیں حیرت ہوئی۔ اول تو یہ کہ ہمیں اور فکر تونسوی کو جس موٹر کے ذریعہ رامپور لے جایا گیا وہ خود خاصی طنزیہ مزاحیہ موٹر تھی اور بڑی ادب شناس بھی تھی۔ چنانچہ پہلی مرتبہ وہ ہاپوڑ پر محض اس لئے خراب ہوئی کہ مولوی عبدالحق کا ہاپوڑ سے گہرا تعلق رہا ہے۔ دوسری مرتبہ وہ رئیس المسافرین حضرت جگر مرادآبادی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مرادآباد پر کچھ اس انداز سے خراب ہوئی کہ جگر مرادآبادی کے کئی شعر جنہیں ہم بھول چکے تھے وہ پھر سے یاد آ گئے۔ فکر تونسوی تو جگر مرادآبادی کو یاد کرتے رہ گئے اور ہم نے دوسروں کی نظریں بچا کر مرادآباد کے دو لوٹے خرید لئے۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

برتنوں کا کاریگر ان لوٹوں پر ہمارا نام بھی لکھنا چاہتا تھا لیکن ہم نے یہ کہہ کر اسے منع کیا کہ ادیب ہونے کے ناتے ہمارا نام رسالوں وغیرہ میں خاصا چھپتا رہتا ہے۔ اس لئے تصنیف و تالیف کے معاملہ میں لوٹے کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہرحال یہ موٹر جگہ جگہ متقدمین کی روحوں کو خراج عقیدت پیش کرتی ہوئی جب رام پور پہنچی تو

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ہمارے ساتھ رام پور کے افسانہ نگار فضیلت اور مشہور ادیب شاہد پرویز بھی تھے۔ "شب قہقہہ" کا پروگرام چونکہ رات کے آٹھ بجے شروع ہونا تھا اس لئے ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہمارے انتظار میں جلسہ چلایا جا رہا ہوگا۔ چنانچہ اس وقت تک مزاحیہ مشاعرہ اپنے پانچویں دور میں داخل ہو چکا تھا۔ غرض ہم لوگوں نے جلسہ کو جلدی جلدی نپٹایا کہ بھوک بہت لگ رہی تھی۔

دوسرے دن ہم رام پور دیکھنے چلے۔ جدھر جائیے لوگ رام پور کے نوابوں کا ذکر کرتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی عمارتیں دکھائی گئیں۔ رام پور کا قلعہ بھی دیکھا جو ہندوستان کے قلعوں میں سب سے کم عمر ہے۔ اس لئے کہ اسّی (۸۰) سال پہلے بنا ہے۔ اس قلعہ کو جنگ لڑنے کے پرانے طریقوں کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا ہے حالانکہ اسّی (۸۰) سال پہلے جنگ لڑنے کے نئے طریقے منظر عام پر آ چکے تھے۔

ہم نے پوچھا "بھئی! اسّی سال پہلے بنے ہوئے قلعے کو پانچ سو سال پرانے قلعوں کے ڈیزائن پر کیوں بنایا گیا ہے؟" ارشاد ہوا "بھئی! نواب رامپور نے جنگ لڑنے کے لئے تھوڑا ہی یہ قلعہ بنوایا تھا۔ یہ قلعہ تو انہوں نے محض اس لئے بنایا تھا کہ روایتی قلعہ کے بغیر نوابی کا مزہ نہیں آتا۔"

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

رام پور جانے سے پہلے ہم نے طئے کر رکھا تھا کہ رام پور کے قابل دید تاریخی مقامات میں سب سے پہلے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات مولانا امتیاز علی عرشی کو ضرور دیکھیں گے۔ مگر رام پور کے احباب ہمیں "نواب رام پور" کے چکر میں پھنسائے چلے جا رہے تھے۔ ہم بھلا کہاں چکر میں آنے والے تھے۔ سو ہم نے برملا اپنی خواہش کا اظہار کیا اور نواب رام پور کی تاریخی عمارتوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر ہم مولانا امتیاز علی عرشی سے ملنے "رضا لائبریری" چلے گئے۔ رضا لائبریری

ہندوستان کی ان چار لائبریریوں میں سے ہے جہاں فارسی اور عربی کے بے شمار مخطوطے موجود ہیں۔ اگر چہ کتابوں سے ہمارا کچھ زیادہ سروکار نہیں ہے مگر جب بھی اپنے اطراف کتابوں کے انبار کو دیکھتے ہیں تو جی کو بڑا آرام آتا ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی کو جب یہ اطلاع ہوئی کہ دو طنز و مزاح نگار ان سے ملنے آئے ہیں تو انہوں نے فوراً ہمیں اندر بلایا۔ مولانا کو ہم نے ویسا ہی پایا جیسا کہ ان کے بارے میں سن رکھا تھا۔ چاروں طرف سے کتابوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ مولانا عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں چلنا پھرنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے مگر بڑی وضع داری کے ساتھ سیاہ شیروانی پہنے آرام کرسی پر بیٹھے مطالعے میں غرق تھے۔ کرسی سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے نہ اٹھنے کی معذرت چاہی۔ کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ انہیں خواب میں دیکھ رہے ہیں۔ مولانا جیسی شخصیتیں اب کہیں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ اس لئے ہم لوگوں نے مولانا کو جی بھر کر دیکھا۔ مولانا بہت دیر تک اردو زبان کے بارے میں اظہار خیال کرتے رہے۔ پھر بولے "میں کوشہ نشینی کی زندگی گذار رہا ہوں۔ اتنی عمر گذارنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بدلے ہوئے حالات میں اردو کی بقا کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اردو کو آسان بنایا جائے۔ میں نے آج تک اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا مگر آج آپ لوگ آئے ہیں تو آپ کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ بھی اس پر غور فرمایئے۔" ہم نے کہا "مولانا! ہمیں غور کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اگر آپ کہیں تو ہم آپ کے خیالات کو لکھ کر چھپوا دیں گے۔ جن لوگوں کو غور کرنا ہے وہ غور کرتے رہیں گے۔"

بولے "مجھے پتہ ہے کہ میرے خیالات چھپیں گے تو لوگ میرے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائیں گے مگر میں زبان کی بقا کو لٹھ سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ اس لئے آپ شوق سے میرے خیالات اردو والوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ پھر فرمانے لگے "میری سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ اردو میں تذکیر و تانیث کو بالکل ختم کر دیا جائے۔" ہم نے کہا "مولانا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دنیا کے سارے کاروبار تو تذکیر و تانیث پر ہی چلتے ہیں اور زندگی کا سب سے بڑا لطف بھی اسی میں ہے۔"

بولے "زندگی میں تو تذکیر و تانیث چلتی رہے گی مگر میں زبان میں اسے ختم کرنا چاہتا

www.taemeernews.com

ہوں۔ اردو میں تذکیر و تانیث کو ہم نے عربی سے اپنایا ہے جب کہ فارسی والے تذکیر و تانیث کے چکر میں نہیں پڑتے۔ انگریزی میں بھی تذکیر و تانیث نہیں ہے۔ انگریزی میں لڑکا اور لڑکی دونوں "I AM GOING." کہہ سکتے ہیں مگر اردو میں لڑکی کو ''میں جا رہی ہوں'' اور لڑکے کو ''میں جا رہا ہوں'' کہنا پڑتا ہے۔

ہم نے کہا ''مولانا کیا آپ کے خیال کے مطابق لڑکی کو بھی 'میں جا رہا ہوں' کہنا چاہئے؟''

بولے ''بالکل کہنا چاہئے۔ اردو شاعری میں تو پچیس تیس برس پہلے تک محبوب کو مذکر ہی باندھا جاتا تھا۔ اس وقت کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔ ادھر جدید شاعروں نے ہی اردو شاعری میں محبوب کی جنس کو تبدیل کیا ہے۔ اگر ہم تذکیر و تانیث کو ختم کر دیں تو زبان بہت آسان ہو جائے گی۔ اگر کوئی اردو زبان سیکھنا چاہے تو اسے پہلے یہ معلوم کرنا پڑتا ہے کہ ''معصومیت''، ''شرافت''، ''جہل'' اور ''علم'' وغیرہ جیسے الفاظ مذکر ہیں یا مؤنث جب کہ فارسی اور انگریزی میں ان الفاظ کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ صرف صفت ہوتی ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اگر ہم تذکیر و تانیث کے چکر سے آزاد ہو جائیں تو دوسروں کے لئے زبان کو سیکھنا آسان ہو جائے گا۔'' (ہم نے جی ہی جی میں کہا مولانا کا تجویز اچھا تو ہے مگر اس پر عمل کرنے میں بہت دشواری آئے گی۔) پھر مولانا گویا ہوئے ''تذکیر و تانیث کے اس جھگڑے کے باعث فارسی کے مقابلے میں اردو کو سیکھنا دس گنا زیادہ دشوار ہے۔'' ہم نے کہا ''مولانا! مگر یہ بھی تو سوچئے کہ اردو کا علاقہ وہی ہے جو ہندی کا ہے اور ہندی میں جب تک تذکیر و تانیث چلتی رہے گی تب تک اردو میں بھی چلتی رہے گی۔ ہم اس لسانی رشتہ سے کیسے الگ ہو سکتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہندی میں بھی تذکیر و تانیث کو ختم کیا جائے۔''

بولے ''میں تو اردو زبان کو آسان بنانے کے بارے میں ایک تجویز پیش کر رہا ہوں۔ ہندی والے اپنے طور پر غور کریں۔ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اردو میں س، ص اور ث کے لئے ایک ہی حرف ''س'' ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں جو ''سہی'' لکھا جاتا ہے وہ اصل میں لفظ ''صحیح'' کی ایک شکل ہے (اسکے ثبوت میں مولانا نے ایک شعر بھی پڑھا تھا جو اب یاد نہیں رہا) اسی طرح اردو کے کئی اور ہم آواز حروف کو کم کیا جا سکتا ہے۔ عوام جسے قبول کریں اسے مان لینا چاہئے۔ مثلاً ہمارے

www.taemeernews.com

ہاں ''اژدہام'' غلط لکھا جاتا ہے۔ صحیح لفظ ''ازدحام'' ہے مگر ''اژدہام'' لکھنے والوں کی اکثریت اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ ''اژدہام'' کو ہی صحیح مان لینا چاہئے۔ ہماری تو ضد سے مشکل ہے۔ ہمارے ہاں 'جانے' کا ماضی 'گیا' بن جاتا ہے جب کہ اصولاً اسے ''جیا'' ہونا چاہئے۔ بہر حال اردو زبان کی بقا اسی میں ہے کہ اسے آسان بنالیا جائے ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔''

رضا لائبریری کے بارے میں مولانا نے کہا ''ہمارے ہاں عربی اور فارسی کے بے شمار مخطوطے ہیں مگر افسوس کہ اتنی بڑی لائبریری سے استفادہ کرنے کے لئے سال بھر میں مشکل سے دس بارہ اسکالر آتے ہیں اور وہ بھی معلومات کے اس ذخیرے سے استفادہ کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔''

جب ہم جانے لگے تو مولانا نے کہا ''میں آپ حضرات کی تشریف آوری کا شکریہ کس زبان میں ادا کروں؟'' ہم نے کہا ''مولانا! شکریہ تو اردو زبان میں ہی ادا کیجئے گا تذکیر و تانیث کے ساتھ۔''

رضا لائبریری سے باہر نکلے تو فکر تونسوی بڑے گمبھیر تھے۔ کہنے لگے ''یار! مولانا نے باتیں بہت صحیح کہیں ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہم صحیح باتوں کو نہیں مانتے۔ اب ایسے لوگ اردو میں کہاں باقی ہیں۔''

اس ملاقات کے بعد دو چار گھنٹوں تک ہم اور فکر تونسوی تذکیر اور تانیث کے بغیر اردو میں بات کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب طبیعت بگڑنے لگی تو پھر رامپور کی تاریخی عمارتوں میں کھو گئے اور دوسرے دن دہلی واپس آ گئے۔

• • •

www.taemeernews.com

مجتبیٰ حسین کے بارے میں تحقیقی مواد

مجتبیٰ حسین کا فن : پروفیسر شکیل الرحمٰن: نومبر 2010، ایم آر پبلی کیشنز 10، میٹروپول مارکٹ، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔110002

مجتبیٰ حسین نمبر ماہنامہ شگوفہ : نومبر 1987، ایڈیٹر: ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، 31 بیچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔500001

مجتبیٰ حسین بحیثیت خاکہ نگار : سردار پاشاہ 1996، گلبرگہ

خصوصی بجلہ : جشن مجتبیٰ حسین منعقدہ شارجہ: 1997، آرٹس پروموشن بیورو، شارجہ (یو اے ای)

مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری : حسن نثی، 2003، ایلیا پبلی کیشن، دہلی۔ ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس، 9، گولہ مارکٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔110002

مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار : ڈاکٹر انسر کاظمی، 2004 ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولہ مارکٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔110002

مجتبیٰ حسین (فن اور شخصیت) : خصوصی شمارہ ''کتاب نما'' مرتبہ: ڈاکٹر محمد کاظم 2004 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

مجتبیٰ حسین۔ایسا کہاں سے لاؤں: پروفیسر شفیع شیخ، 2005 سینی بک ایجنسی، 53 ابراہیم رحمت اللہ روڈ، 11، امین بلڈنگ، ممبئی۔400003

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری : پیرزادہ ارشاد احمد، 2007 رام پورہ، باندی پورہ، کشمیر

مجتبیٰ حسین اور گلبرگہ : مرتبہ: احسان اللہ احمد، 2008 انجمن ترقی اردو ہند، گلبرگہ، اسٹیشن روڈ، گلبرگہ (کرناٹک)

اردو ادب کے تین بھائی : مرتبہ: رفیق جعفر، 2008 حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، 2390، خان بہادر ہدایت اللہ روڈ، اعظم کیمپس، پونے 411001

مختلف رسالوں، ماہنامہ 'صبا' حیدرآباد ☆ 'الفاظ' علی گڑھ ☆ ماہنامہ 'انشاء' کولکتہ ☆ ماہنامہ 'شاعر' ممبئی ☆ ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد ☆ ماہنامہ 'عدسہ' حیدرآباد ☆ سہ ماہی 'الانصار' حیدرآباد کے علاوہ روزنامہ 'جنگ' کراچی ☆ روزنامہ 'آزاد ہند' کولکتہ ☆ روزنامہ 'جنگ' لندن ☆ روزنامہ 'آفتاب' بھوپال ☆ روزنامہ 'منصف' حیدرآباد کے خصوصی گوشے۔ ☆☆

سفرِ لخت لخت